www.urducouncil.nic.in

فروری 2022 ، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تا کہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

اس شمارے میں

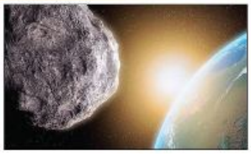

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
بھارت کا قومی ترانہ اور اس	خواجہ عبدالمنتقم	06
عبدالکریم کا جنگل	طہٰ نسیم	09
اپنے بوجھ کو نیچے اتار دو	سیدہ نوشاد بیگم محمود	12
تاریخ و تہذیب		
قلعۂ دولت آباد	دلاری قریشی	14
نظمیں		
اے مرے ہندوستاں!	علیم صبا نویدی	18
اچھے دا	عطاء الرحمٰن	19
زندہ باد	فیض رتلامی	19
علم کی دولت سب پر بھاری	مشتاق شمسی	20
صورتِ انسان ملتے پیرہن	آزاد سونی پتی	21
قلم	راحت مظاہری	22
روبوٹ میاں	فہیم احمد	23
یوگ کرے کوئی	ضیاء الرحمٰن جعفری	24
کوئل	اشتیاق راشد	24
گاؤں اور بچپن	مومن محمد مصطفیٰ غفران احمد	25
دیا زندگی کا	نثار بانو	25
ڈراما		
حامد حیات ہے	مشتاق کریمی	26
ترجمہ		
جنگل میں اسکول نہیں	منوہر چمولی منو، مترجم: رضوان مصطفی	28
بچوں کے بڑے ادیب		
عطا عابدی ادب اطفال کا نمائندہ تخلیق کار	رضوان خان	30
کہانیاں		
اشتہار اور روم ہیٹر	خورشید حیات	33
مثالی دوستی	آبینا زجان علی	36
میں آزاد ہوں	ذاکر علی	40
کہانی جنگل کی	محبوب حسن	43
لالچی کوے کا انجام	صبیحہ تزئین	45
لال چھتری	صاحبہ فردوس	48
بچوں کا کتب خانہ		
بچوں کا ڈائجسٹ 'سلاح کار'	حقانی القاسمی	51
سائنس نامہ		
خطرناک خردسیارہ 'ڈائی ڈیموس'	انیس الحسن صدیقی	53
معلومات عامہ		
ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کی تشکیل نو	نصیر افسر	57
صحت اطفال		
وٹامن	ابوطالب انصاری	59
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		61
ننھے فنکار		

بچوں کی دنیا

جلد: 10 شمارہ: 02 فروری 2022

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: شاہنواز محمد خرم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:49539009-11

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10روپے، سالانہ/100روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون:26109746
ای میل:sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

پیارے بچو! 'زبان' قدرت کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ زبان ہی ہے جو انسان کو دیگر بہت سی مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ ذرا سوچو اگر انسان کے پاس زبان نہ ہوتی تو وہ کس طرح بات کرتا، کس طرح اپنے خیالات کو پیش کرتا۔

بچو! انسان کے اندر بولنے کی صلاحیت فطری طور پر موجود ہے، اس لیے ہر ملک، ہر قبیلے اور ہر معاشرے میں الگ الگ زبانیں بنتی چلی گئیں۔ اس وقت ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 6 ہزار زبانیں بولی یا سمجھی جاتی ہیں، لیکن اب بہت سی زبانیں تیزی سے مٹتی جارہی ہیں۔ گلوبلائزیشن کی وجہ سے چند مخصوص زبانوں کا سیکھنا اور ان میں کام کرنا ضروری ہوگیا ہے، اس لیے بہت سے لوگ اپنی ان زبانوں کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں جو چند بستیوں، یا قبیلوں تک محدود ہیں۔ اس طرح محدود علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں اور محدود ہوتی جارہی ہیں۔ بعض سروے کے مطابق موجودہ عہد میں 40 فیصد سے زیادہ زبانوں پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ زبانوں کا مٹنا یقیناً انسانیت کا بہت بڑا خسارہ ہے، کیونکہ زبان مٹتی ہے تو اس سے جڑی ہوئی ثقافت بھی مٹ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفکرین اور ماہرین زبانوں اور تہذیبوں کو بچانے کے لیے فکرمند ہیں اور وہ مادری زبان کے تحفظ کو لازمی قرار دے رہے ہیں۔ اب ساری دنیا نے مادری زبان کی اہمیت کو تسلیم کرلیا ہے۔ اسی لیے مادری زبان کے تعلق سے بیداری لانے کے لیے ہر سال فروری کے مہینے میں 21 تاریخ کو عالمی یوم مادری زبان کے طور پر منایا جاتا ہے۔

پیارے بچو! مادری زبان کا تعلق اس زبان سے ہے جو آپ کے ماں باپ، رشتہ دار اور خاندان والے بولتے ہیں اور یہی وہ زبان ہوتی ہے جو بچہ سب سے پہلے سیکھتا ہے کیونکہ بچہ ماں کی گود میں آنکھیں کھولتا ہے اور پرورش پاتا ہے۔ ماں اسے کھلاتی پلاتی ہے، اس سے باتیں کرتی ہے، اسے لوریاں سناتی ہے۔ ماں کے الفاظ، ماں کی باتیں بچوں کے ذہن میں اس وقت بیٹھ جاتی ہیں جب کہ وہ باشعور بھی نہیں ہوتے۔ چھ ماہ کا بچہ غیر شعوری طور پر زبان سیکھنے لگتا ہے، لیکن اس وقت وہ جو کچھ سیکھتا ہے، وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں وغیرہ کے ذریعے ہی سیکھتا ہے۔ پھر جب وہ سال دو سال کا ہوتا ہے تو بغیر پڑھے لکھے اس زبان کو بولنے بھی لگتا ہے۔ اس زبان میں نہ صرف ماں باپ کے الفاظ شامل ہوتے ہیں بلکہ ان کا کلچر بھی رچا بسا ہوتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ بچہ مادری زبان میں مختلف علوم وفنون کو آسانی سے سیکھ سکتا ہے۔ ہماری نئی تعلیمی پالیسی میں بھی مادری زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ جہاں بچے مختلف مضامین کو آسانی سے سمجھ سکیں، وہیں ان کی مادری زبان بھی زندہ رہے۔ والدین کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم مادری زبان میں ہی دلائیں اور ان کے ذہن میں مادری زبان کی اہمیت کو بٹھائیں تاکہ وہ بڑے ہوکر بھی اس سے جڑے رہیں اور ان کی مادری زبان زندہ رہے۔ اس طرح ہزاروں زبانیں مٹنے سے بچ جائیں گی۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' کا ماہ نومبر کا شمارہ ملا۔ کہانی کی اشاعت اور شمارے کا شکریہ۔ اس میں شامل ہمارے معتبر نوعمر قلم کاروں کی تخلیقات کے مطالعہ سے طبیعت خوش ہوگئی۔ واقعی بچوں کے اس رسالے نے تاریخ رقم کی ہے۔ اس کی مشمولات میں شخصیت سازی، سائنس، معلومات عامہ، تفریح اور کھیل غرض بچوں کی دلچسپی کا سارا سامان موجود ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل نے اداریے میں بچوں کے حقوق، ان کی تعلیم اور کھیل کی اہمیت پر نہایت سلیس انداز میں اظہار خیال کیا ہے۔

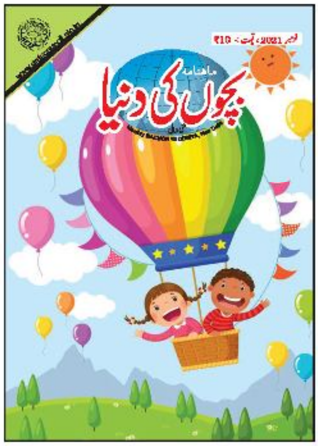

اس شمارے کی نثری اور شعری تخلیقات میں مجھے خصوصاً 'جیک پو کی محنت...'، 'ہماری شرارتیں اور چھدّا ابّا' نظموں میں عبدالرحیم نشتر کی تخلیق 'ممی کیوں بھیجا کھاتی ہیں' اور عطیہ پروین کی نظم 'اچھی بچی' کا معصومانہ رنگ پسند آیا۔ شکیل سہسرامی کی نظم بچوں کو اچھے اخلاق اور اپنی زبان سے محبت کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ہلکی پھلکی نصیحت آمیز کہانیاں بھی مطالعے کی دعوت دیتی ہیں۔ سائنس نامہ کے تحت خلیہ کا تعارف قابلِ تعریف مضمون ہے۔ حقانی صاحب کے قلم سے 'بچوں کا کتب خانہ' کا سلسلہ اہمیت کا حامل ہے۔

یہ خوش آئند بات ہے کہ حالیہ شماروں میں مثبت تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ احقر کا مشورہ ہے کہ ایک صفحہ منفرد نوعیت کے انعامی مقابلوں کے لیے مختص کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ روایتی قسم کے مقابلوں کے برعکس ایسے مقابلے جن سے بچوں کی تفہیمی صلاحیت کی جانچ ہو اور ان کے ادبی شوق کو مہمیز کرنے میں ممدو معاون ہوں۔

حلیمہ فردوس، بنگلور، کرناٹک

'بچوں کی دنیا' نومبر 2021 کا شمارہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس شمارے میں داتا گنج بخش، جیک پو کی محنت رنگ لائی اور اسمارٹ فون کا استعمال اور طلبا کی صحت اچھے مضامین ہیں۔ 'بین الاقوامی یوم تحمل و بردباری' بھی پسند آیا۔ رونق جمال کا مضمون 'بچپن کا شوق اور خوش حالی' قابل ستائش ہے۔ اچھی بچی، اب کے یوں دیوالی آئے، فصل بہاراں اچھی نظمیں ہیں۔ کہانیوں میں 'گھڑی' پسند نہ آئی، البتہ جہانگیر انس کی کہانی 'عقلمند اندھا' بہت اچھی لگی۔ پرویز احمد یعقوبی کی کہانی 'ایثار و سخاوت' اور سعدیہ پروین کی کہانی 'خرگوش اور چور' بہت پسند آئی۔ فیاض احمد کی کہانی 'بٹو اور مینو' بھی اچھی ہے۔ محمد اسلم تنویر کی کہانی 'سی سی ٹی وی کیمرہ' من کو بھا گئی۔ کاش آج ایمانداری پر نوکریاں ملتیں۔ میں خلیہ ہوں، چمن چمن کے پھول اور اداریہ بھی پسند آیا۔ 'بند گوبھی کے طبی فوائد' کی اشاعت کے لیے میں آپ سب کا ممنون ہوں۔

عبدالمجید مکرو، اروانی، کلگام، جموں و کشمیر

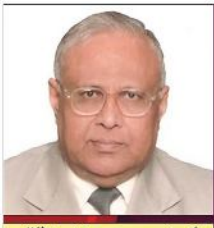

خواجہ عبدالمنتقم

بھارت کا قومی ترانہ اور اس کی اہمیت و تاریخی پس منظر

بچو! ہر ملک کی کچھ قومی نشانیاں ہوتی ہیں جیسے قومی جھنڈا، قومی ترانہ، قومی گیت، قومی پرندہ، قومی جانور، قومی پھول وغیرہ۔ اپنا قومی ترانہ 'جن گن من' تو آپ کو زبانی یاد ہی ہوگا اور آپ نے خود بھی اپنے اسکول میں کتنے ہی موقعوں پر گایا ہوگا۔ اس کے علاوہ 26 جنوری، 15 اگست اور دیگر سول وفوجی تقاریب میں موقع کے مطابق فوجی دستوں اور اسکولی بچوں کو گاتے دیکھا ہوگا یا اس کی دھن سنی ہوگی لیکن کیا کبھی آپ کے دماغ میں یہ سوالات آئے، جن کے جوابات ہم نے ان کے نیچے دیے ہیں:

سوال: قومی ترانہ کیا ہوتا ہے؟

جواب: قومی ترانہ، جسے ہم راشٹر گان بھی کہتے ہیں، ملک کے تئیں وفاداری اور حب الوطنی کا گیت ہے جسے سرکاری طور پر ملک کی شناخت کے اظہار کے طور پر گایا یا بجایا جاتا ہے۔ اس میں اپنے ملک کے تئیں سچی محبت اور قدرتی لگاؤ کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ بچو! ملک سے محبت ایک ایسا جذبہ ہے کہ اگر کوئی ملک سے باہر بھی کہیں چلا جائے تو بھی وہ زندگی بھر اپنے ملک اور اپنے وطن کو کبھی نہیں بھولتا۔

سوال: قومی ترانہ اور قومی گیت میں کیا فرق ہے؟

جواب: قومی ترانہ ملک کے تئیں وفاداری اور حب الوطنی کا گیت ہے جسے سرکاری طور پر ملک کی شناخت کے اظہار کے طور پر ایک مخصوص طریقے سے محدود وقت میں گایا یا بجایا جاتا ہے۔ اس کے لیے بصد احترام کھڑا ہونا قانوناً لازمی ہے۔ قومی

گیت میں بھی ملک کے تئیں وفاداری اور حب الوطنی کی جھلک نظر آتی ہے جیسے بینکم چندر چٹرجی کے ذریعے لکھا گیا گیت 'وندے ماترم' لیکن اس کا گانا یا اس کے لیے کھڑا ہونا قانونی مجبوری نہیں البتہ اس کا احترام ضروری ہے۔

سوال: قومی ترانہ کب اور کیوں گایا جاتا ہے؟

جواب: قومی ترانہ شخصیات باوقار جیسے صدر، گورنر وغیرہ کے اعزاز میں سلامی دیتے وقت، سول وفوجی تقاریب، پریڈ، قومی پرچم لہرائے جانے جیسے مواقع وغیرہ پر گایا یا بجایا جاتا ہے۔

سوال: کیا ہر موقع پر مکمل ترانہ گایا جاتا ہے یا کبھی مختصر ترانہ بھی گایا جاتا ہے؟

جواب: ہمارے ملک کا قومی ترانہ مختلف موقعوں پر دو طریقوں سے گایا یا بجایا جاتا ہے یعنی کچھ موقعوں پر مکمل ترانہ گایا یا بجایا جاتا ہے تو کچھ موقعوں پر اسے اس کی مختصر شکل میں گایا یا بجایا جاتا ہے۔ مختصر ترانہ فوجی میس میں اظہار احترام کے لیے رسمی طور پر کچھ پیتے وقت (بطور Toast of Honour) بجایا جاتا ہے۔ بچو! اس ترانے کی مکمل عبارت کا تو آپ سب کو علم ہے ہی لیکن اس کی مختصر شکل سے بہت کم لوگ واقف ہیں، جو درج ذیل ہے:

'جن گن من ادھینا یک جے ہے
بھارت بھاگیہ ودھاتا
جے ہے جے ہے جے ہے
جے جے جے، جے ہے'

سوال: قومی ترانے کا احترام کیوں ضروری ہے؟

جواب: قومی ترانہ ہمارے ملک کی قومی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ اس لیے اس کا احترام ضروری ہے۔ ہماری حکومت نے قومی وقار کے احترام کو یقینی بنانے کے لیے 1971 میں ایک قانون بھی بنایا تھا۔ اگر کوئی شخص اس کا احترام نہیں کرتا تو اسے اس قانون کے تحت سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ بچو! آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم تو بچے ہیں اور ہماری عمر 18 سال سے کم ہے، ہمیں تو سزا دی ہی نہیں جاسکتی مگر ایسا نہیں ہے۔ اگر آپ نے کوئی جرم کیا ہے اور آپ کی عمر 18 سال سے کم ہے تو آپ کے جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے آپ کو آپ کی اصلاح اور حفاظت کے لیے بنائے گئے اداروں جیسے بچوں کا گھر (Children's home) یا بچوں کے لیے بنائے گئے خصوصی گھر (Special homes) بھیجا جاسکتا ہے۔ جو بچے جرم کرتے ہیں ان سے متعلق معاملات کی سنوائی کے لیے خصوصی عدالتیں بھی بنائی گئی ہیں۔

سوال: یہ ترانہ کس نے لکھا تھا؟

جواب: یہ ترانہ نوبل انعام یافتہ رابندر ناتھ ٹیگور نے لکھا تھا۔ بچو! بنگلہ دیش کا قومی ترانہ 'آمار شونار بنگلہ' بھی رابندر ناتھ ٹیگور نے ہی لکھا تھا۔ انھوں نے یہ ترانہ، جسے بنگلہ دیش نے اپنے قومی ترانے کے طور پر اپنا لیا اس وقت لکھا تھا جب بنگال 1905 میں پہلی مرتبہ تقسیم ہوا تھا۔

سوال: یہ ترانہ کس زبان میں ہے؟

جواب: یہ ترانہ بنگالی زبان میں ہے لیکن اسے دیوناگری رسم الخط میں ہندی زبان میں اپنایا گیا تھا۔

سوال: یہ ترانہ پہلی مرتبہ کب گایا گیا تھا؟

جواب: یہ ترانہ پہلی مرتبہ انڈین نیشنل کانگریس کے کلکتہ، جس کا اب نیا نام کولکاتا ہے، میں منعقدہ اجلاس میں 27 دسمبر 1911 میں گایا گیا تھا۔

سوال: جن گن من کی پہلی ادائیگی (Performance) کب ہوئی؟

جواب: 11 ستمبر، 1942 کو ہیم برگ میں۔

سوال: اس ترانے کو کب اپنایا گیا اور کیسے اپنایا گیا؟

جواب: یہ ترانہ ہماری آئین ساز اسمبلی نے 24 جنوری 1950 کو اپنایا تھا۔ آئین ساز اسمبلی وہ ادارہ تھا جسے ہمارے ملک کا آئین بنانے کا اختیار حاصل تھا۔

سوال: کیا کسی کو ترانہ بجتے یا گائے جانے کے وقت اس میں خلل ڈالنے کا حق ہے؟ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو کیا اسے کوئی سزا دی جاسکتی ہے؟

جواب: اگر کوئی قومی ترانہ گانے سے روکتا ہے یا کسی ایسے مجمع میں جہاں ترانہ گایا جارہا ہو کوئی رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو اسے 3 سال تک کی قید کی سزا یا جرمانے کی یا دونوں کی سزا دی جاسکتی ہے۔ اگر یہ شخص دوبارہ یا بار بار ایسا کرتا ہے تو اسے ہر بار کم از کم ایک سال کی قید کی سزا دی جائے گی۔

بچو! بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جنھیں کرنا قانوناً لازمی ہوتا ہے جیسے قومی ترانہ گاتے وقت کھڑا ہونا۔ اسی طرح آئین کے تحت ہر شہری کا یہ بنیادی فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کے آئین پر کاربند رہے اور ملک کے جھنڈے اور قومی ترانے کا احترام کرے۔ اس کے علاوہ ہمارے ملک کی وزارت داخلہ نے بھی 5 مارچ 2015 کو تمام ریاستوں کے لیے یہ حکم جاری کیا تھا کہ وہ اپنی اپنی ریاستوں میں اس بات کو یقینی بنائیں کہ تمام اسکولوں میں قومی ترانہ گایا جائے۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قومی ترانہ کسی بھی مجمع میں سب مل کر گا سکتے ہیں بشرطیکہ ایسا مادر وطن کے تئیں اظہار عقیدت و احترام کے طور پر کیا جاتا ہے اور ایسا کرتے وقت سلیقہ مندی سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ تاکید بھی کی گئی تھی کہ جب بھی کسی مجمع میں قومی ترانہ گایا جائے تو وہاں موجود تمام افراد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بصد احترام تب تک کھڑے رہیں جب تک وہ ختم نہ ہو جائے۔ ان ہدایات میں مزید یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہاں تک کسی مجمع یا فنکشن یا ان مواقع کی بات ہے جن میں قومی ترانہ گایا جائے اس کے بارے میں تمام مواقع کی وضاحت ممکن نہیں ہے۔ یہ فیصلہ متعلقین کو کرنا ہوگا کہ موقع کی نوعیت کے پیش نظر قومی ترانہ گایا جانا ضروری ہے یا نہیں۔

سوال: قومی ترانہ گانا کتنے منٹ میں ختم ہو جانا چاہیے؟

جواب: سرکاری احکام کے مطابق 52 سیکنڈ کے اندر اندر۔

سوال : کیا دوسرے ملک کے قومی ترانے کا احترام کرنا ضروری ہے؟

جواب : بچو! ہم سب کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ ہم اپنے ملک کے قومی ترانے کے ساتھ ساتھ دوسرے ممالک کے قومی ترانوں کا بھی احترام کریں مگر اس سلسلے میں ہمیں کچھ احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ مان لیجیے کہ ہمارے ملک میں کسی دوسرے ملک کا قومی ترانہ بج رہا ہے تو ہمیں احتراماً کھڑا تو ہو جانا چاہیے لیکن مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے چونکہ ہم دوسرے ملک کے تئیں اپنی وفاداری کا ثبوت دے ہی نہیں سکتے۔ ہماری وفاداری ہمارے آئین تک محدود ہے۔ اگر ہم دوسرے ملک کے ترانے کے الفاظ کو دہرائیں گے تو یہ یقینی طور پر ناقابل قبول ہوگا۔

بچو! آپ بھی جب قومی ترانہ گایا جارہا ہو یا اس کی دھن بجائی جارہی ہو تو آپ اس وقت نہایت سنجیدگی کا ثبوت دیں، سلیقے سے کھڑے رہیں اور کوئی بھی ایسی حرکت نہ کریں کہ جس سے ہماری اس قومی نشانی کی بے حرمتی ہو۔

[جنوری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف شائع ہوچکا ھے]

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartment, 2-I,P Extn
Delhi- 110092
Mob: 9818369624
E-mail: amkhwaja2007@yahoo.co.in

عبدالکریم کا جنگل

انسانی زندگی کا دارومدار بہت حد تک جنگلات پر ہے۔ زندگی کے لیے بنیادی آکسیجن سے لے کر لکڑی، دوائیں اور کروڑوں لوگوں کو روزگار جنگلوں سے ملتا ہے۔ جنگلات ماحولیاتی تبدیلی کو قابو میں رکھتے ہیں۔ سمندر کے بعد جنگل کاربن کے سب سے بڑے گودام ہیں جو گرین ہاؤس گیسوں کا توازن برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

زندگی کے اتنے اہم جزو کو ہم برباد کرنے میں مصروف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے صرف 1990 سے 2015 کے بیچ ہم نے جنوبی افریقہ کے رقبے کے برابر جنگلات ختم کردیے۔ جب جنگل ختم ہوتا ہے تو ایک دنیا ختم ہوجاتی ہے کیونکہ وہاں رہنے والے چرند، پرند، کیڑے مکوڑے اور پیڑ پودے تو ہلاک ہوتے ہیں آکسیجن کا اہم ذریعہ بھی ختم ہوجاتا ہے۔ مٹی برباد ہوجاتی ہے اور موسم پر اثر انداز ہونے والی ہریالی باقی نہیں رہتی۔

شاید آپ کو یہ جان کر تعجب ہو کہ دو ارب افراد جنگلات پر انحصار کرتے ہیں اور آج بھی بیس کروڑ افراد جنگلات میں رہائش

طٰہٰ نسیم

طٰہٰ نسیم کا تعلق دہلی سے ہے۔ اردو، ہندی اور انگریزی تینوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔ ان کی تقریباً 70 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ کامکس پر مشتمل ان کی چُن مُن سیریز بہت مقبول ہوئی۔ میری دلچسپ کہانیاں، برف کا سپاہی، آپ پوچھیں ہم بتائیں، بچوں کے لیے اسلامی معلومات، ابن بطوطہ دہلی میں، ہنستے ہنستے جینا سیکھو، اردو چمن، آسان اردو قواعد، ڈائناسور کی خوفناک دنیا ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انھیں دہلی اردو اکادمی اور اترپردیش اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔

پذیر ہیں اور ان کی روزی روٹی کا ذریعہ یہ جنگلات ہیں۔ جنگلات سے ہمیں دوائیں کاسمیٹک اور صابن و ڈٹرجینٹ پاؤڈر بنانے کا سامان بھی حاصل ہوتا ہے۔

جنگلات کروڑوں جانوروں کا مسکن ہیں۔ دنیا کے 80 فیصد جانور جنگلات میں رہتے ہیں۔ دنیا بھر کے جنگلات میں چھ کروڑ افراد رہتے ہیں جنھیں ہم قبائلی لوگ کہتے ہیں۔ جنگلات ہمیں زندہ رکھنے میں جدوجہد کررہے ہیں وہ ہمارے ماحول کے لیے نقصان دہ گرین ہاؤس گیسوں کو جذب کر کے ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھتے ہیں۔ جنگلات مٹی اور تازہ پانی بچا کر رکھتے ہیں۔ ان کی وجہ سے مٹی کا کٹاؤ نہیں ہوتا جہاں جنگلات ختم ہوجاتے ہیں وہاں بارش یا سیلاب میں زرخیز مٹی بہہ جاتی ہے۔

درخت چٹانوں کے کھسکنے، برف کے طوفان اور مٹی کے کٹاؤ کے سامنے رکاوٹ بن کر کھڑے رہتے ہیں۔ ان کی جڑیں مٹی کو تو تھامے رکھتی ہیں بارش کے پانی کی بڑی مقدار بھی محفوظ کرلیتی ہیں۔ درخت جتنا پرانا ہوتا ہے وہ ہوا سے اتنی ہی زیادہ کاربن ڈائی آکسائیڈ لے کر اسے آکسیجن میں تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہم تجارتی ضرورتوں اور بڑھتی آبادی کے سبب درختوں کو زمین سے بے دخل کررہے ہیں اور ہر سال ملک یونان کے برابر جنگلات کو کاٹ کر ختم کررہے ہیں۔

کیرل کے ایک حوصلہ منداور محنتی انسان عبدالکریم نے دن رات محنت کر کے بنجر زمین پر 28 ایکڑ جنگل بنادیا۔ آج پوری دنیا سے لوگ اس جنگل کو دیکھنے آرہے ہیں۔ عبدالکریم نے جنگل اگانے کا کام 1977 میں شروع کیا تھا جب انھوں نے کچھ لوگوں سے بے کار اور بنجر زمین خرید کر جنگل اگانے کا ارادہ کیا تو لوگ ان کا مذاق اڑاتے تھے اور انہیں دیوانہ سمجھتے تھے لیکن عبدالکریم نے ہمت نہیں ہاری اور انھوں نے اپنی زندگی جنگل اگانے کے اپنے خواب کو سچ کرنے میں لگادی۔

عبدالکریم جب چھ سات سال کے تھے تو ایک مرتبہ ان کے گھر کے پاس پہاڑیوں کے جنگل میں آگ لگ گئی۔ سیکڑوں درخت اور پیڑ پودے جل کر راکھ ہوگئے۔ ان کے ساتھ بہت سارے پرندے اور جانور بھی مارے گئے۔ ننھے عبدالکریم کے دل میں پیڑ پودوں اور جانوروں کے لیے رحم پیدا ہوگیا۔ وہ

بڑے ہوکر ملازمت کرنے مشرق وسطیٰ چلے گئے اور وہاں بڑی محنت سے اپنا کاروبار جمایا۔ 1977 میں وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر کیرل آ گئے اور انھوں نے شمالی کیرل کے کوٹا پورم میں جہاں ان کا گھر تھا۔ اپنے پڑوسیوں سے ایسی زمین خریدنی شروع کردی جو بنجر تھی۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ عبدالکریم اس بے کار زمین کا کیا کریں گے۔ انھوں نے 3750 روپے میں پانچ ایکڑ زمین خرید لی۔ پتھریلی زمین پر جنگل اگانا ناممکن تھا۔ اس علاقے میں ایک سوکھا کنواں تھا جسے عبدالکریم نے دوبارہ شروع کرنا چاہا لیکن کامیابی نہیں ملی۔ ان کے علاقے میں بے روزگاری زیادہ تھی۔ انھوں نے بے روزگار لوگوں کو پودے لگانے کا کام دیا۔ وہ روزانہ انھیں نقد اجرت دیا کرتے تھے۔ اس سے لوگوں کو کام تو ملا ہی وہ پودے لگانے میں دلچسپی لینے لگے۔ عورتیں کافی دور سے پانی لے کر آتیں۔ انھوں نے ایک سال محنت کر کے کافی حد تک کامیابی حاصل کر لی کہ ایک دن اس جگہ آگ لگ گئی اور عبدالکریم کی محنت پر پانی پھر گیا۔

عبدالکریم دوبارہ نئے حوصلے کے ساتھ اپنے کام میں لگ گئے اور انھوں نے نئے سرے سے پودے لگانے شروع کر دیے۔ آج ان کے جنگل کو بنے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں اور عبدالکریم اس جنگل میں ہی قدرت کی گود میں رہتے ہیں۔

جس علاقے میں انھوں نے جنگل لگایا ہے وہ کیرل کا سب سے گرم علاقہ ہے۔ وہاں بارش بھی بہت کم ہوتی ہے۔ اس علاقے کے کسان پوری طرح مانسون پر منحصر ہیں۔ اگر مانسون تاخیر سے آئے یا بارش کم ہو تو یہاں پانی کی شدید قلت ہو جاتی ہے۔ یہاں جنگل لگنے کے سبب بارش بھی ہونے لگی ہے۔ اور پودے پانی کو روکنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اس لیے عبدالکریم کے جنگل میں پانی کی کمی نہیں ہوتی اور یہاں سے کوئی بھی شخص مفت میں پانی لے جا سکتا ہے۔ ان کے جنگل میں تقریباً 1500 قسم کی جڑی بوٹیاں اگتی ہیں اور پرندوں کی سیکڑوں اقسام رہتی ہیں۔

عبدالکریم کی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت کیرل نے انہیں کئی انعامات سے نوازا ہے۔ تعلیمی ادارے اور فلاحی تنظیمیں ان سے جنگلات اور ماحولیات کے تحفظ پر لیکچر دلواتی ہیں۔ ان سے تحریک پا کر ہزاروں افراد نے ماحولیات کو بچانے کے لیے کام شروع کر دیا ہے۔

ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت کیرل نے ملیالم کی درجہ چھ کلاس میں ان پر ایک مضمون شامل کیا ہے۔ سی بی ایس ای نے بھی چوتھی کلاس میں ان پر سبق شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھیں کئی قومی اور بین الاقوامی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

امریکہ کی ریاست کنکٹیکٹ کے ٹرینٹی کالج کا ایک وفد ان کے جنگل کا دورہ کر چکا ہے اور ان سے ماحولیات وجنگلات کے تحفظ پر تبادلہ خیال کر چکا ہے۔ عبدالکریم لوگوں کو مفت پودے تقسیم کر کے درخت اگانے کے لیے حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اس طرح جنگل اگا کر وہ ملک و قوم کی ہی خدمت نہیں کر رہے بلکہ ہمارے نبی محمد...... کی تعلیمات پر بھی عمل کر رہے ہیں۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ...... نے فرمایا: ''جو مسلمان کوئی پودا لگاتا یا کھیتی بوتا ہے اور اسے کوئی پرندہ یا انسان کھاتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ بن جاتا ہے۔''

(بخاری)

■

Taha Naseem
2793, Pahari Bhojla
Delhi - 110006

اپنے بوجھ کو نیچے اتار دو

سیدہ نوشاد بیگم محمود

ہم بہت زیادہ توقعات رکھیں اور حقیقت میں کچھ اور ہی پیش آئے۔ یہ واقعات تو ہر ایک کی زندگی میں آتے ہی ہیں ہم جب کچھ بھی اُمید نہیں رکھتے اور ہمیں اچانک سے کوئی خوشی، کوئی کامیابی مِل جائے اُس کا کوئی توڑ نہیں ہوتا۔ ہمارے لگائے ہوئے ائیرکنڈیشن کی بہ نسبت اچانک کوئی ہوا کا ٹھنڈا جھونکا ہمارے جسم کو چھو کر گزر جائے تو وہ ہمیں زیادہ خوشی دے جاتا ہے۔

نفسیات کے پروفیسر نے کلاس کی شروعات ہی ہاتھ میں ایک پانی کا گلاس لے کر کی۔ انھوں نے تمام طلبہ کی توجہ اپنی جانب مرکوز کرتے ہوئے سوال پوچھا۔ آپ کو کیا لگتا ہے؟ اس گلاس کا وزن کتنا ہوگا؟ 150 گرام، 100 گرام، 50 گرام۔ یہ آوازیں طلبہ کی جانب سے آرہی تھیں۔ اس کا صحیح وزن کتنا ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جب تک اس گلاس کا وزن نہیں کروں گا تب تک مجھے صحیح معلوم نہیں ہوگا۔ لیکن میرا سوال ایسا ہے کہ اگر میں اس گلاس کو چند منٹ ایسے ہی پکڑ کر رکھوں تو کیا ہوگا؟

کچھ بھی نہیں ہوگا؟ بچوں نے جواب دیا۔ اچھا یہ گلاس اسی طرح میں نے ایک آدھ گھنٹہ پکڑ کر رکھا تو کیا ہوگا؟ آپ کے ہاتھوں میں درد ہوگا۔ ایک طالب علم نے جواب دیا..... بالکل صحیح... اور اگر میں اس گلاس کو اسی طرح دن بھر پکڑ کر رکھوں تو کیا ہوگا؟ آپ کا ہاتھ بے حِس ہوجائے گا، ہاتھوں میں جھنجھناہٹ محسوس ہوگی۔ ہاتھ وزن دار ہوجائے گا۔ شاید آپ کو اسپتال بھی جانا پڑ جائے۔ تمام طلبہ نے مِل کر کہا اور وہ ایک ساتھ زور زور سے ہنسنے لگے۔

بہت اچھے! لیکن ان تمام وقت میں اس گلاس کے وزن میں کچھ فرق پڑا کیا؟ پروفیسر نے پوچھا، طالب علم نے کہا۔ نہیں... پھر ہاتھ میں درد ہونے لگے گا۔ بے حِس ہوجائے گا۔ جھنجھناہٹ محسوس ہوگی ایسا کیوں؟ یہ پروفیسر کا سوال تھا اور اس سوال پر تمام طلبہ کے چہرے پر بوکھلاہٹ دکھائی دی۔ یعنی مجھے جو تکلیفیں ہورہی ہیں اُس سے میں باہر کیسے نکلوں گا؟ یہ تھا پروفیسر کا کراس سوال... اُن میں سے ایک طالبہ نے جواب دیا۔ سر گلاس نیچے رکھ دیجیے۔ بالکل صحیح پروفیسر نے کہا۔ (بچو! مجھے کراس کے لیے اُردو لفظ سمجھ میں نہیں آیا آپ تلاش کرکے بتانا)

آپ کو زندگی میں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کا حل بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنے سر پر وہ بوجھ تھوڑے وقت رکھنا ٹھیک ہے۔ ہم نے اگر زیادہ وقت تک اپنے دماغ میں رکھا اور حد سے زیادہ اُس کے بارے میں سوچا تو پھر وہ ہمیں پریشانی اور تکلیف میں ڈال دے گا۔ دکھ میں مبتلا کردے گا۔ اس کی تکلیف پھر برداشت سے باہر ہوجائے گی۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ ہم نے پکڑ کے رکھا تو یقیناً ہم لُولے، لنگڑے یا معذور ہوجائیں گے۔ ہمیں کچھ بھی سُجھائی نہیں دے گا اور ہم کچھ کرنے کے لائق بھی نہیں رہ جائیں گے۔ ہم اُن مسائل کے درمیان پوری طرح گِھر جاتے ہیں یا اُس میں ڈوب جاتے ہیں۔

ہمیں اپنی زندگی میں آنے والے مسائل اور للکار کے متعلق بھی ضرور سوچنا چاہیے۔ لیکن اسے بوجھ نہ بننے دینا چاہیے۔ یہ بات زیادہ اہم ہے کہ ہر روز سونے سے پہلے اُس گلاس کی طرح یہ مسائل ہمیں نیچے رکھنے ہوں گے۔ تب ہی ہم تناؤ سے دور رہ سکیں گے۔ ہم صبح تازہ دم ہوکر اٹھ سکیں گے اور نئے نئے چیلنج قبول کرنے کے قابل ہوں گے، طاقتور بنیں گے۔

تو بچو! اب اسکول، کالج یا گھر سے باہر نکلو تو اس مقام کے مسائل ہمیشہ ہمیشہ نیچے اتار کر رکھنے کی عادت ڈالو۔

مصائب سے اُلجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

تناؤ تو ایک مرض کی طرح ہوتا ہے جس کا علاج نہیں ہوتا۔ ریسرچ سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ 5 میں سے 4 مریض ایسے تشخیص ہوتے ہیں جو کہ جسمانی طور پر کم اور ذہنی طور پر بیمار پائے جاتے ہیں۔ 85% مریضوں کی بیماری کی وجہ ان کی فکریں اور ذہنی تناؤ ہی ہوتا ہے۔

فرصت کا وقت اچھے کاموں میں لگایئے، جیسے آپ کو کرافٹ، ڈرائنگ مصوری، موسیقی جو بھی فن سیکھنا ہے وہ سیکھو۔ اور خود کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ اچھے ہنر سیکھنے میں مگن رکھو۔ اگر قرآن شریف کی تلاوت کررہے ہو تو ترجمے کے ساتھ پڑھ لو۔ مطلب سمجھ میں آجائے گا۔ عربی زبان کی تھوڑی بہت معلومات ہوجائے گی۔ خود کو تخلیقی اور تعمیری کام میں لگاؤ۔ تو اسکول کالج کی دنیا سے ہٹ کر بیرونی دنیا کی بھی معلومات حاصل ہوگی۔ جو کہ اگر جب تم سند لے کر باہر نکلوگے تو یہ دنیا تمھیں بالکل انجان نہ لگے۔ وہ اس لیے کہ اگر تم کمپیوٹر کی بھی معلومات سیکھ لیتے ہو تو بہت سی معلومات سے تمہاری قبل از وقت ہی آگاہی ہوچکی ہوگی اور تمھارے لیے سہولت فراہم ہوجائے گی۔

اگر آپ کی پسند کے مطابق کام آپ کو نہ ملے ہوں تو جو کام ملے ہیں اُن میں آپ کی پسند کس طرح شامل ہوسکتی ہے یا وہ آپ کے لیے پسندیدہ کام کس طرح بن سکتے ہیں وہ دیکھیے۔ رادھا کرشن جیسے دانشور کہتے ہیں۔ واقعات ہم بدل نہیں سکتے۔ لیکن ان واقعات سے متعلق نظریہ تو ہم بدل سکتے ہیں نا؟ تو اپنا نظریہ ہی بدل دیجیے۔ منفی سوچ نہ رکھتے ہوئے اسے مثبت سوچ میں تبدیل کردیجیے۔ پھر دیکھیے کتنی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

نہ ہم سفر نہ کسی ہم نشیں سے نکلے گا
ہمارے پاؤں کا کانٹا ہمیں سے نکلے گا

(راحت اندوری)

[فروری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف ملاحظہ فرمائیں]

■

Syeda Noshad Begum Mahmood
Shri Darshan Apts.: 203
Shastri Nagar
Kalwa - 400605
Mumbra, Thana (Maharashtra)
Mob.: 9867650210

قلعۂ دولت آباد

قلعۂ دولت آباد، جو کسی زمانے میں دیوگری کہلاتا تھا، یادو گھرانے کے راجہ بھیلم پنچم نے 1187 عیسوی میں تعمیر کروایا۔ ایک تکون نما پہاڑی کو تراش کر اسے دفاعی نقطہ نظر سے بھارت کا سب سے مضبوط قلعہ بنانے میں کوئی کسر نہ رکھی گئی۔ بھول بھلیاں، اندھیری کا راستہ اور قلعے کے اطراف ایک گہری خندق نے قلعے کو ایک محفوظ مقام بنا دیا کہ دشمن کی کوئی بھی چال اُسے جیتنے میں ناکام بنا دے۔ اسی لیے اِس قلعے کو ناقابل تسخیر کہا گیا۔ زمانہ قدیم میں خندق کو پار کرنے کے لیے ایک چمڑے کا پل بنایا گیا تھا جو رات کے وقت اٹھا لیا جاتا تھا۔ بعد میں اسے مستقل بنا کر خندق کو پار کرنے کے لیے لوہے کا پل تعمیر کر دیا گیا۔ آج اسی لوہے کے پل سے سیاح قلعے میں داخل ہوتے ہیں۔

یادو خاندان کے مشہور و معروف راجہ، راجہ رام دیو کے دور میں اس قلعے کو فتح کرنے کا سہرا علاؤالدین خلجی کے سر جاتا ہے کہ اس نے اپنی تدبیروں سے قلعے کو فتح کرنے میں کامیابی حاصل کی اور قلعے میں موجود بے حساب دولت کو وہ اپنے ساتھ دہلی لے گیا۔ ایک اندازے کے مطابق جیت سے حاصل شدہ خزانہ اس قدر زیادہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کی پانچ پشتوں تک یہ دولت قائم رہی۔ اس دولت کو شمار کیا جائے

دلاری قریشی

ڈاکٹر دُلاری قریشی کا تعلق اورنگ آباد سے ہے۔ وہ ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی اورنگ آباد میں ڈپارٹمنٹ آف ٹورزم اینڈ منٹریشن کی ڈائرکٹر اور پروفیسر ہیں۔ انھوں نے تاریخ میں ایم اے، اور آرٹ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کی تقریباً 14 کتابیں انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہیں جن میں آرٹ اینڈ وژن آف اورنگ آباد گیوز، اورنگ آباد نامہ، آرٹ اینڈ آرٹی ٹیکچر آف اجنتا اینڈ ایلورا گیوز، دولت آباد فورٹ اور گیٹس آف اورنگ آباد بہت مشہور ہیں۔ انگریزی کے مؤقر اخبارات میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے غیر ملکی جامعات میں بھی گیسٹ لیکچر دیے ہیں۔ اورنگ آباد کی تاریخ اور آرٹ پر ان کی گہری نظر ہے۔

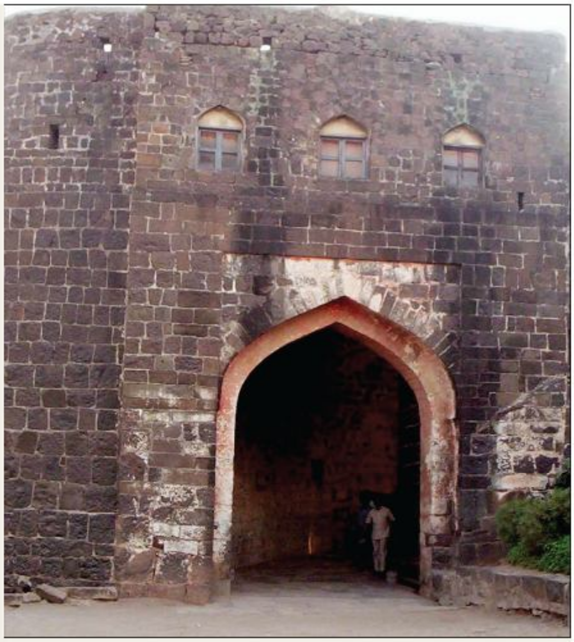

تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس میں چھ سو من سونا، سات من زیورات ، دو من قیمتی پتھر جن میں ہیرے جواہرات شامل ہیں، خلجی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے علاوہ ایک ہزار من چاندی اور چار ہزار گز ریشم کے تھان بھی اِس بے شمار دولت کا حصہ ہے جس نے علاؤالدین کو انتہائی متمول بنا دیا۔ راجہ رام دیو نے قلعہ دولت آباد پر 1271 تا 1310 تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا شنکر دیو تخت کا وارث بنا۔ قلعے پر ایک اور حملہ علاؤالدین خلجی کے بیٹے سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے کیا اور شنکر دیو کو شکست دی۔ 1318 میں راجہ رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے اِس شکست کو قبول نہیں کیا لیکن قطب الدین مبارک شاہ کے ہاتھوں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ قلعۂ دولت آباد پر مختلف بادشاہی گھرانے قابض ہوئے، ان میں محمد تغلق نے نہ صرف قلعے کو فتح کیا بلکہ اِسے اپنی راجدھانی بھی بنایا اور دہلی کی رعایا کو حکم دیا کہ وہ تمام دہلی چھوڑ کو دولت آباد چلے آئیں۔ یہ ایک عجیب و غریب تانا شاہی حکم تھا جسے رعایا نے بڑی بد دلی اور خاموشی کے ساتھ قبول کیا اور بالآخر دہلی کے تمام باشندے مجبوراً دولت آباد چلے آئے۔ ان میں کئی باشندے یعنی مصنوعات کے کاریگر، صوفی اور بزرگانِ دین بھی شامل تھے۔ اِس طرح یہاں کمخواب اور دستی صنعتیں قائم ہوئیں۔ اِن دستی مصنوعات میں کاغذ کی صنعت نے بھی دولت آباد کی اہمیت کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ صنعت کاغذ سازی آج بھی دولت آباد کے قریب کاغذی پورہ نامی بستی میں موجود ہے۔ اِس کاغذ کو شاہی سرپرستی حاصل ہوئی۔ اسی طرح ریشم اور زر کے تاروں سے بنایا جانے والا کپڑا اب ہمرو مشروع کے نام سے اورنگ آباد میں تیار ہوتا ہے۔

محمد تغلق کا بسایا ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں ایک شہر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ حضرت امیر خسرو نے جب دولت آباد کی شان و شوکت دیکھی تو اِسے بغداد کے مماثل شہر قرار دیا۔ دولت آباد کی سیاحت کرنے والوں میں بہت ہی اہم نام ابن بطوطہ، محمد قاسم فرشتہ، ضیاؤالدین برنی، احسن سنجری وغیرہ شامل ہیں۔

محمد تغلق کے دور میں ایک اہم کام پانی کی دستیابی کا تھا کہ محمد تغلق کے استاد قتلغ خاں نے قلعے سے کچھ دوری پر ایک بڑے حوض کی تعمیر کی۔ پہاڑیوں سے اُترتا پانی حوض میں جمع ہو جاتا تھا۔ یہ دراصل ایک تالاب کے مانند تھا۔ یہ پانی درہ آب پاش سے ہوتا ہوا دولت کے ہاتھی حوض میں جمع ہو جاتا تھا۔ پانی کی نکاسی کا ایک اور ذریعہ قلعے کے اوپر موجود دو قدرتی چشمے ہیں۔ ایک کو کھڑی ٹانکہ اور دوسرے کو ہاتھی ٹانکہ کہا جاتا ہے۔ ان چشموں کا پانی انتہائی صاف اور میٹھا ہے۔ ملک عنبرؒ کے زمانے میں بھی نہر کے ذریعے پانی کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس طرح قلعے میں کبھی بھی پانی کی قلت محسوس نہیں کی گئی۔

محمد تغلق کے بعد دولت آباد میں بہمنیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ امیرانِ صدہ نے محمد تغلق سے بغاوت کر کے حسن گنگو بہمنی کو بادشاہ مقرر کیا۔ اس کی تاجپوشی قلعہ دولت آباد میں ہی انجام

پائی۔ حسن گنگوہی بہمنی کے بعد اُس کی اولاد نے قلعے پر حکومت کی۔ ان میں فیروز شاہ بہمنی کی اہمیت یوں واضح ہے کہ اس نے یہاں پر ایک رصد گاہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرا اہم بادشاہ علاؤالدین بہمنی دوم ہے جس نے مشہورِ زمانہ چاند مینار کی تعمیر 1445 میں کی۔ اس مینار کی اونچائی 210 فٹ اور گھراؤ 70 فٹ ہے۔ اس لحاظ سے یہ بھارت کا دوسرا بلند مینار ہے۔ پہلا بلند مینار دہلی کا قطب مینار ہے جسے قطب الدین ایبک نے تعمیر کیا تھا۔ اِس کی بلندی 240 فٹ ہے۔

چاند مینار کے نشیبی حصے میں ایک مسجد تعمیر کی گئی ہے جس پر ایک کتبہ موجود ہے جو علاؤالدین بہمنی دوم کی شان و شوکت اور اُس کی شخصیت کی مدح میں کندہ کیا گیا ہے۔ اِس کتبے کے مطابق جو فارسی زبان میں ہے علاؤالدین کے بارے میں لکھا ہے کہ ”یہ ایک عظیم الشان بادشاہ ہے جس کا چہرہ مانند ماہتاب ہے۔ اُس کی زبان شہد سے زیادہ میٹھی ہے۔ جب تکلم کرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ شان و شوکت میں وہ ایران کے بادشاہ جام و جمشید سے بھی آگے ہے۔ مینار کی تعمیر قرن فل نامی شخص نے ایرانی طرز میں کی ہے۔“

بہمنی بادشاہوں میں حسن گنگوہی بہمنی کا بھی بڑا تعاون رہا ہے کہ اُس نے دولت آباد سے غارہائے ایلورہ تک ایک شاہراہ کی تعمیر کی اور بعد از تعمیر وہ بہ نفسِ نفیس ایلورہ کے غار دیکھنے کے لیے آیا۔ اس موقع پر ایلورہ کے غاروں کی صاف صفائی کی گئی اور بادشاہ نے اپنے درباریوں اور اپنے احباب کے ساتھ ایلورہ کا معائنہ کیا۔ یہاں پر موجود ایک کتبہ کے فارسی ترجمہ کروایا جس کے لیے بڑے بڑے پنڈتوں کو مدعو کیا گیا جنھوں نے اس کام میں بڑی مدد کی۔ کتبے کا فارسی ترجمہ یوں ہے:

”اب ہمارے بعد کسی کو اس طرح کا بڑا کام کرنے کا خیال پیدا ہو تو لازم ہے کہ ایک ہزار ماہر فن کو جمع کرے اور اپنے خزانے کا منہ کھول دے اور ہزار سال تک کام کرتا رہے تب جا کر اِس طرح کا کام کرنا ممکن ہوگا۔ اسے دیکھ کر لوگ ہمیں نیکوکاری سے یاد کریں گے۔ پر چندراؤ۔“

بہمنیوں نے بعد میں اپنا دارالخلافہ دولت آباد سے گلبرگہ منتقل کر دیا۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد دکن میں پانچ سلطنتیں وجود میں آئیں۔ احمد نگر کے نظام شاہی، گولکنڈہ کے قطب شاہی، بیدر کے برید شاہی، بیجاپور کے عادل شاہی اور برار کے عماد شاہی۔

بعد میں احمد نگر کے نظام شاہیوں نے قلعہ دولت آباد پر قبضہ کر لیا۔ یہاں ملک عنبرؒ نے قلعے کو مزید مضبوطی عطا کی اور ایک طویل فصیل تعمیر کی جو عنبر کوٹ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔

بہمنیوں نے قلعے کے اندرونی حصے میں مہا کوٹ اور کالا کوٹ تعمیر کروائیں۔ اِس کے بعد مغلوں نے قلعے پر قبضہ کیا۔ ملک عنبرؒ کے فرزند فتح خان کو شکست دے کر قلعہ اپنی تحویل میں لے لیا اور یہاں بارہ دری تعمیر کروائی۔ 1636 میں شاہ جہاں نے اپنے بیٹے اورنگ زیب کو قلعے کا صوبہ دار بنایا۔ بعد

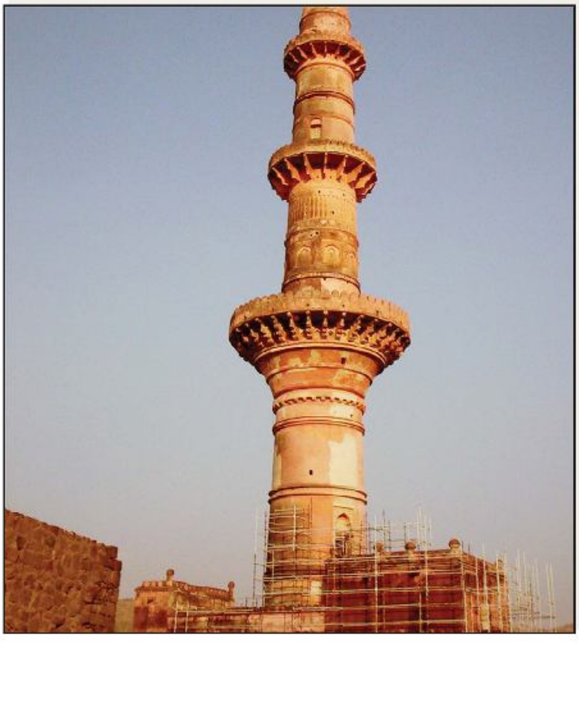

میں اورنگ زیب دولت آباد سے اورنگ آباد منتقل ہوگیا۔ اُس کی پہلی صوبے داری 1636 سے 1644 تک رہی، بعد میں اُس کا تبادلہ کابل اور قندھار جیسے دور دراز علاقوں میں کردیا گیا۔ 1653 میں واپسی کے بعد 1658 تک دوسری صوبے داری کا فرض نبھایا اور پھر بھائیوں سے جنگ جیت کر دہلی میں اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔ اپنی صوبے داری کے دور میں اورنگ زیب نے اورنگ آباد میں اپنی بیوی دلرس بانو بیگم کی یاد میں ایک مقبرہ تعمیر کروایا جو آج 'بی بی کا مقبرہ' کہلاتا ہے۔

مغلوں کے بعد قلعے پر مراٹھوں کا اور بعد میں نظام حیدرآباد کا تسلط رہا۔ دولت آباد قلعہ اور شہر دیوگری کے متعلق سیاحوں نے بڑی دلچسپ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ قلعے کے اندرونی حصے میں چند غار ہیں جو جین طبقے کے بنائے ہوئے ہیں۔ محمد تغلق نے ان غاروں کو قیدخانے میں بدل دیا تھا جہاں انتہائی خطرناک مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ ایک دلچسپ بات ابن بطوطہ نے یہ بھی بتائی کہ تغلق نے ان غاروں میں بڑے بڑے چوہے پال رکھے تھے۔ یہ چوہے اس قدر بھیانک تھے کہ بلیاں بھی ان سے ڈرتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے دولت آباد کے بازاروں کا حال بھی لکھا ہے کہ کس طرح سڑک کے کنارے بیوپاری اپنی دکانیں سجاتے تھے۔ یہاں سونے چاندی اور جواہرات کی کھلے عام خرید و فروخت ہوتی تھی۔

احمد نگر کے نظام شاہی وزیر ملک عنبرؒ نے یہاں ایک عمارت تعمیر کروائی تھی جو 'رنگ محل' کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔

ایک بہت عالی شان مندر جو جین طبقے کے شاہوں نے تعمیر کروایا تھا آج بھی بہت اچھی حالت میں موجود ہے۔ آزادی ملک کے بعد یہاں بھارت ماتا کی موتی نصب کردی گئی اور اب بھارت ماتا کا مندر کہلاتا ہے۔ ورثے کے شائقین اور محبان نے 'عالمی ورثہ ہفتہ' کی مناسبت سے حال ہی میں ہیری ٹیج واک کا اہتمام کیا تھا۔ اپنے ورثے کی جستجو اور عوام میں ورثے کی بیداری پیدا کرنے کے لیے ہیری ٹیج واک یعنی 'وراثتی گشت' ایک بہت ہی مقبول و مشہور کارگزاری ہے جس نے شہریوں کو اپنے ماضی سے متعارف کروایا اور ایک نظیر قائم کی۔

مضمون کے آخر میں قطب شاہی سلاطین کے آخری بادشاہ ابوالحسن تاناشاہ کا ذکر ضروری ہے کہ اس نے دولت آباد کے 'چینی محل' میں قید و بند کی مصیبتوں کو برداشت کرتے ہوئے دنیائے فانی سے ملک عدم کی راہ لی اور اپنے پیر و مرشد حضرت راجو قتال حسینیؒ کے بازو میں واقع خلدآباد میں دفن ہوا۔

■

Dr. Dulari Qureishi
N-13, Sector A, Plot No.: 75
Cidco, Near Himayat Baugh
Aurangabad-431001 (Maharashtra)

نظم

اے مرے ہندوستاں!

علیم صبا نویدی

علیم صبا نویدی کا تعلق تمل ناڈو سے ہے۔ ناقد، شاعر کی حیثیت سے ان کی ایک الگ شناخت ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی بہت سی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، خاص طور پر تمل ناڈو کی ادبی تاریخ کے حوالے سے ان کی کتابیں بہت اہمیت اور وقعت کی حامل ہیں۔ تمل ناڈو کے مشاہیر ادب، تمل ناڈو میں اردو ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ بڑوں کے علاوہ بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں۔ ان کی تخلیقات بچوں کے مختلف رسائل و جرائد میں چھپتی رہی ہیں۔ شاید ہی ہندوستان کا کوئی ایسا مجلہ ہو جس میں ان کی تخلیقات شائع نہ ہوئی ہوں۔ انھوں نے متعدد اصناف میں شاعری کی ہے۔ ان کی ادبی خدمات کو دیکھتے ہوئے مختلف اکادمیوں نے انھیں اعزازات سے بھی نوازا ہے۔

وادیاں تیری ہیں دلکش، باغ ہیں تیرے حسیں!
چومتا ہے جھک کے چرخ نیلگوں تیری جبیں
تیرا ہر ذرّہ ہے ارمانوں کی فردوسِ بریں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

لہلہاتے کھیت تیرے، اونچے اونچے کوہسار
ہیں تری آغوش میں جب تک کروڑوں جانثار
یہ حقیقت ہے کہ تجھ پہ آنچ آسکتی نہیں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

اس چمن کو ہم نے سینچا ہے لہو کی دھار سے
ہم کفن بردوش اٹھیں گے تری للکار سے
تیری ہر آواز گونجے گی رگِ جاں کے قریں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

تجھ سے ہے آباد ہر اک آرزو، ہر اک اُمنگ
قطرہ قطرہ موتیاں، لعل و گہر ہیں خشت و سنگ
صبح ہے تیری سہانی، شام ہے تیری حسیں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

تجھ سے جانے کتنے ارباب ہنر پیدا ہوئے
اہلِ دل، اہلِ خرد، اہلِ نظر پیدا ہوئے
آج بھی دنیا کے نقشے میں ترا ہمسر نہیں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

حوصلہ اونچا ہے تیرا، عزم ہے تیرا بلند
کوئی کیا پہنچا سکے گا تیری ہستی کو گزند
جل کے رہ جائیں گے دشمن کی امیدیں سب یہیں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

عدل ہے دستور، امن و آشتی تیرا اصول
رہ زنی تجھ سے عبث ہے، دشمنی سے فضول
آج بھی ہر طرح سے بے داغ ہے تیری جبیں
اے مرے ہندوستاں، میرے وطن، میری زمیں

■

Aleem Saba Naveedi
No: 266, Triplicane High Road
Chennai- 600005 (Tamil Nadu)
Cell.: 9176137462

اہے وا

عطاء الرحمن طارق

بھوت جب ہم کو ریاضی کے ستانے لگ جائیں
اٹھ کے ہم رات میں 'تعویذ' بنانے لگ جائیں

باغ میں پھول کروندے کے جب آنے لگ جائیں
ہم بھی مالی کو چچا کہہ کے بلانے لگ جائیں

قہر آلود نگاہیں وہ دُرّیہ مِس کی
دیکھ لیں جس کی طرف ہوش ٹھکانے لگ جائیں

پان دے آئیں ذرا جا کے عنایت سر کو
کردیا پاس— تو ہم دھوم مچانے لگ جائیں

اتنے آسان سوالات، 'اہے وا، اہے وا'
جی میں آتا ہے ابھی جھوم کے گانے لگ جائیں

[مارچ 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف ملاحظہ فرمائیں]

■
Ataur Rahman Tariq
701/3A, Vijaya Co-op. Hsg. Society
Vaishali Nagar
K.K Road, Mahalaxmi
Mumbai - 400011 (Maharashtra)

زندہ باد

زندہ باد اے مرے بھارت تجھے کرتے ہیں نمن تو ہے بچوں کا وطن
اک مہکتا ہوا گلزار ہے خوشبو کا چمن — تو ہے بچوں کا وطن
پاٹھ شالہ تری کالج مدرسے تیرے
بچہ بچہ یہی کہتا ہے کہ سب ہیں میرے
ہے بڑائی تری ایسی لگے سورج کی کرن — تو ہے بچوں کا وطن
پھولتے پھلتے یہ بچے ہیں تری بانہوں میں
آگے آگے یہ بڑھے جاتے ہیں سب راہوں میں
ایک دن چوم ہی لیں گے یہ ترا نیل گگن — تو ہے بچوں کا وطن
اپنے ماں باپ کی خدمت یہ کریں گے دل سے
وقت آیا تو وطن پہ یہ مریں گے دل سے
اور کرتے ہی رہیں گے یہ ترقی کا جتن — تو ہے بچوں کا وطن
وعدہ کرتے ہی رہیں گے سدا ایمان پہ یہ
فخر کرتے ہیں تری آن پہ اور شان پہ یہ
روح گنگا ہے تری تیرا ہمالہ ہے بدن — تو ہے بچوں کا وطن
گنگا جمنا یوں ہی بہتی رہیں حسرت ہے یہی
ساری ندیاں یہاں پاون ہیں محبت ہے یہی
بولیاں ایسی ہیں جیسے کہ بہیں گنگ و جمن — تو ہے بچوں کا وطن
فیض رتلامی کی چاہت ہیں یہ پیارے بچے
آفتاب اور سبھی چاند ستارے بچے
یہ کویتا بنے شاعر کا بھی بنتے ہیں سخن — تو ہے بچوں کا وطن

[دسمبر 2020 کے شمارے میں ان کا تعارف شائع ہوچکا ہے]

■
Faiz Ratlami (Adeeb)
48, Samta Nagar (Anand Colony)
Ratlam - 457001 (MP), Mob.: 7879690200

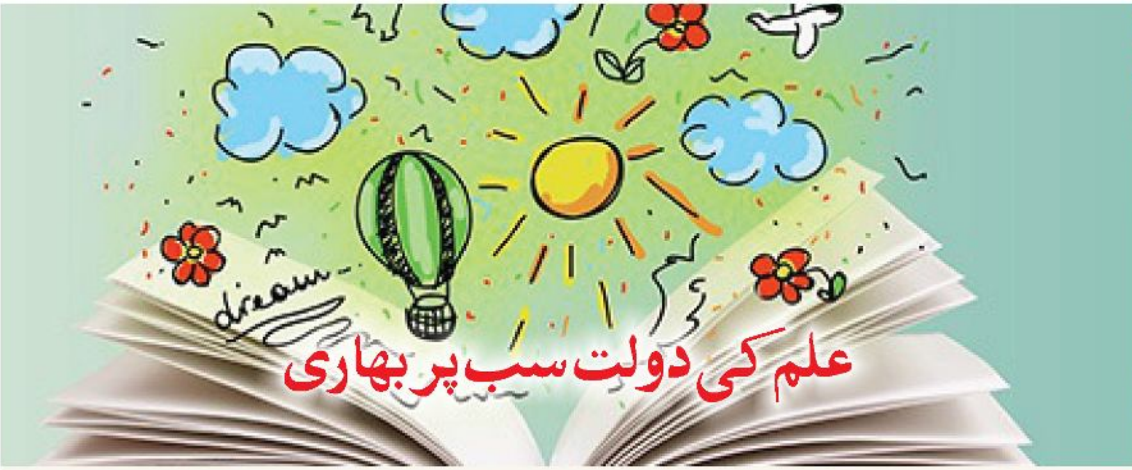

علم کی دولت سب پر بھاری

مشتاق شمسی

مشتاق شمسی کا تعلق دربھنگہ بہار سے ہے۔ انھوں نے ایم ایس سی اور بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی کئی اہم تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں جن میں آئینہ احساس (کہانیوں کا مجموعہ)، سومنی (ہندی ناول)، بہار کے چند ادبی ستارے (تحقیق)، میرا کارج میرا انوبھو (ہندی)، درد کا احساس (ہندی)، بہار کے مزاحیہ شعرا، رہگزر سے آگے (کہانیاں) قابل ذکر ہیں۔ فن داستان گوئی، کالی پٹی (ناول)، شمالی بہار کے شعرا زیر طبع ہیں۔

ہم نے اک تصویر بنائی
جو پپو کے من کو بھائی

ایک کتاب اور ایک قلم ہے
پس منظر میں اک پرچم ہے
پرچم پر ہے نام محمدؐ
جس سے منور کل عالم ہے

جب پپو نے سر کو جھکایا
تب ہم نے اس کو یہ بتایا

علم سے انساں کی بیداری
علم سے انساں کی ہوشیاری
علم سے راہ حق ملتی ہے
علم کی دولت سب پر بھاری

پھر پپو نے لی انگڑائی
ہم نے آگے بات بڑھائی

سب سے افضل سب سے اعلیٰ
نبیوں میں اک کملی والا
دنیا کے گوشے گوشے میں
جس کی آمد سے ہے اجالا

■

Mushtaq Shamshi
Village: Sundarpur, Post: Kharahwa
Distt.: Darbhanga - 847115 (Bihar)
Mob.: 9798971031

آزاد سونی پتی

صورتِ انسان ملتے پیرہن

نام تھا اس کا ہوشیار
اسے ملا ایسا اک انساں
آہستہ سے اس سے بولا
ہوجائے مجھ پہ جو عنایت
ہوشیار ہوٹل میں لایا
اس نے دیں دعائیں ڈھیر
دیکھ لیا اک رب کا بندہ
نیک کام یہ تم نے کیا ہے
تیرے دل میں ہو جو ارماں
ہوشیار دیکھ اس کی صورت
سمجھ نہیں کچھ آتا ہے اب
بندۂ رب ہنس کر بولا
اسی فکر میں گھر وہ پہنچا
کیسی فکر میں ہو تم ابا

گیا ایک دن وہ بازار
جو لاغر تھا حال پریشاں
بھوکا ہوں میں چار روز کا
کھانے کی بن جائے صورت
اور اسے بھر پیٹ کھلایا
ہوا وہ انساں جس دم سیر
ہوشیار سے آکر بولا
بول تمہاری خواہش کیا ہے
مانگ لے مجھ سے تو اے انساں
بولا آپ کی بڑی عنایت
کل مانگوں گا بندۂ رب
سوچ سمجھ کے کل آجانا
اس کی دختر نے پھر پوچھا
ہوشیار نے سب کہہ ڈالا

ہنس کر اس کی دختر بولی
ساتھ تمھارے میں بھی چلوں گی
حالاں کہ وہ اک بچی تھی
دوجے دن مل کر بابا سے
بندہ رب یہ میری بچی
اس کو میری طلب سمجھنا
بچی وہ بابا سے بولی
ہر حالت میں شاد رہیں ہم
بابا بچی سے یہ بولا
رب کی تم پر مہر رہے گی
بچو! رکھنا ہر دم یاد

ذرا سی بات ہے بڑی اداسی
اور بابا سے میں مانگوں گی
لیکن وہ ہشیار بڑی تھی
بولا اپنا سر خم کرکے
آپ سے جو کچھ بھی مانگے گی
سر پر ہاتھ ہمارے رکھنا
ایک طلب ہے یہی ہماری
اور خدا کا شکر کریں ہم
واہ وا بچی، بچی واہ وا
تو ہر صورت شاد رہے گی
سب سے کرو ایسی فریاد

■

R.K. Azad
1794, Sector-15,
Sonipat- 131001 (Haryana)

قلم

راحت مظاہری

ڈاکٹر راحت مظاہری قاسمی کا طب، ادب، صحافت سے تعلق ہے۔ دعوت و تبلیغ کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کرتے ہیں۔ نعت، غزل، رباعی، قطعات، ماہیا، دوہا گوئی بھی ان کا میدان ہے۔ نئی نسل کی آبیاری کی طرف ان کا خاص رجحان ہے۔ بچوں کے لیے نظم و نثر دونوں میں انھوں نے کتابیں تحریر کی ہیں۔ ادب اطفال کے تعلق سے ان کی دو کتابیں 'تتلیاں' اور 'چندا ماما' شائع ہو چکی ہیں اور ان کے مزید دو مجموعے تیار ہیں۔

بھرمار ہو ستم کی
صورت نہ ہو کرم کی
ہتھیار کیوں اٹھاؤ؟
تلوار ہو قلم کی
ہر ساز ہے قلم میں
اعجاز ہے قلم میں
اوزار خود قلم ہے
سردار خود قلم ہے
بیکس کا دیکھیے تو؟
غم خوار ہی قلم ہے
ہر ساز ہے قلم میں
اعجاز ہے قلم میں
اللہ نے بھی کھائی
سوگند ہے قلم کی
حاکم کو کون جانے
دولت ہے سب قلم کی

ہر ساز ہے قلم میں
اعجاز ہے قلم میں
سویا نہیں ہے انساں
بیدار گر قلم ہے
پیچھے ہنر ہیں جس سے
شہکار وہ قلم ہے
ہر ساز ہے قلم میں
اعجاز ہے قلم میں

■

Rahat Mazahiri Qasmi
New Delhi
3/18, Street No.: 8
Gurudwarar Mohalla Maujpur
Delhi - 110053
Mob.: 9891562005
Email.: e_rahatmazahiri@gmail.com

فہیم احمد

روبوٹ میاں

آؤ تم سے بات کروں میں
سنو سنو روبوٹ میاں!

مانا کہ تم ابو جی کو
پانی دے سکتے ہو لاکر
ہاتھ بٹا سکتے امی کا
برتن کپڑے دھلوا کر

میرے سوالوں کو کاپی میں
کرسکتے ہو نوٹ میاں؟
سنو سنو روبوٹ میاں!

تم تو ہو بے شرم بڑے ہی
کپڑے نہیں پہنتے کیوں
کہاں تمہارے جوتے موزے
ننگے پاؤں ہو چلتے کیوں

بولو تو میں ہی سلوا دوں
سنگ پینٹ کے کوٹ میاں!
سنو سنو روبوٹ میاں!

محنت کرنا شوق تمھارا
کرتے ہو تم کام سبھی
طاقت کم ہوجاتی ہے تو
گر بھی جاتے کبھی کبھی

مجھے بتاؤ کیوں نہ روتے
لگے تمھیں جب چوٹ میاں
سنو سنو روبوٹ میاں!

■

Dr. Faheem Ahmad
Asst. Prof., Dept of Hindi
Mahatma Gandhi Memorial (P.G) College
Chaudhry Sarai
Sambhal - 244302 (UP)
Mob.: 8896340824

یوگ کرے کوئی

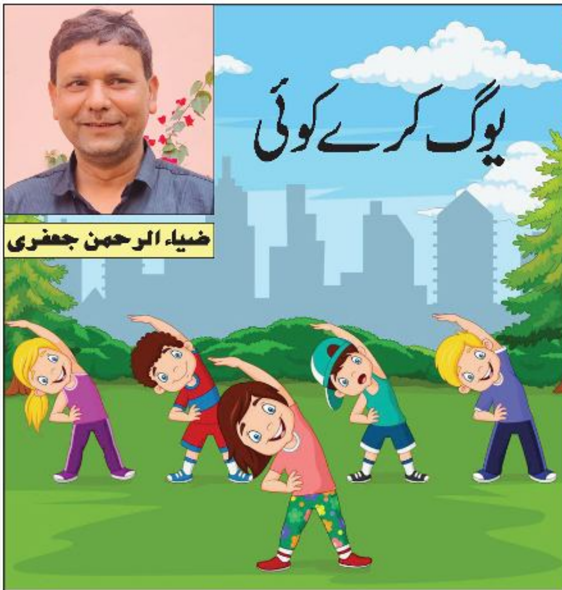

بہت ہے لیکن چھوٹی زیبا — کھا کر ہوگئی موٹی زیبا
شام ہوئی تو سو جاتی ہے — رات میں اٹھ اٹھ کر کھاتی ہے
باہر جب بھی زیبا جائے — چھوڑ کے سب گول گپّے کھائے
دودھ وہ سارا پی جاتی ہے — بھوک نہ پھر بھی مٹ پاتی ہے
بنی ہوئی ہے سب کی رانی — مانگتی ماں سے ہے بریانی
پاپا بھی تو آتے جاتے — خوب مٹھائی اسے کھلاتے
مما بھی جب ملنے آئیں — مکھن اور ملائی لائیں
چلے تو نہ چل پائے زیبا — پل بھر میں تھک جائے زیبا
پر اب زیبا فٹ ہی رہے گی — سنا ہے اب وہ یوگ کرے گی

[فروری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف ملاحظہ فرمائیں]

■

Dr. Zeaur RahmanJafri
High School Mafi +2
Via-Asthawan, Dt-Nalanda - 803107 (Bihar)
Mob.: 9934847941, 6205254255

کوئل

کتنی میٹھی اس کی بولی
سن کر ساری دنیا ڈولی
ساون کی ہے وہ دیوانی
بچو! باغوں کی ہے رانی
وہ تو شاعر کی ہے دلبر
دیکھو! رکھتی ہے پا 'سُر' پر
جب جب رم جھم برسے پانی
پھر دیکھو اس کی من مانی
چڑیا ہے وہ ایک نرالی
پر اس کی رنگت ہے کالی
کوے نے اس کو پالا ہے
ہاں! سرگم کی وہ خالہ ہے
سننے کو ترسے رہتے ہیں
ہم اس کو کوئل کہتے ہیں

■

Ishtiaque Ahmed
3, P.M Bustee, 2nd Bye Lane
Shibpur, Howrah - 2
Howrah - 711102
Mob.: 8240162221

مومن محمد مصطفےٰ غفران احمد

گاؤں اور بچپن

جب گاؤں میں اپنا بچپن تھا تب زیست سہانی ہوتی تھی
ہر دن غزل سا لگتا تھا ہر شام دیوانی ہوتی تھی

سوئیٹر بنتے ہوئے نانی سنایا کرتی تھی نظمیں
ہر رات کہانی پریوں کی دادی کی زبانی ہوتی تھی

صبح ہوا کرتی تھی جب چڑیوں کی آوازوں سے
اور دور کسی درخت پر تب کوئل کی روانی ہوتی تھی

ہر شام میں دوست جمع ہوکر کھیلنے جایا کرتے تھے
کھیل کے چند اصول تھے کچھ شرط نبھانی ہوتی تھی

مل جل کر رہنا سکھاتے تھے گاؤں کے سب بزرگ ہمیں
روٹھے ہوئے بچوں کی انھیں صلاح کرانی ہوتی تھی

سب دوست اکٹھا ہوکر کھاٹ بچھاتے کھیتوں میں
نیم کے نیچے ہم سب کو محفل بھی سجانی ہوتی تھی

نہ چاہ تھی دولت شہرت کی نہ خوف تھا جینے مرنے کا
دنیا کا فسانہ کچھ بھی نہ تھا بس اپنی کہانی ہوتی تھی

■

Momin Mohd Mustafa Ghufran Ahmad
Qila, Gali No.: 3
Malegaon - 423203
Distt.: Nashik (Maharashtra)
Mob.: 7447818312

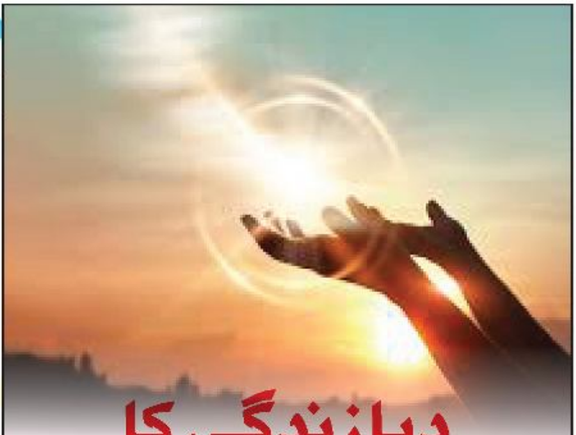

دیا زندگی کا

دیا زندگی کا مری بجھ نہ جائے
سرا زندگی کا کہیں چھوٹ نہ جائے

چلو آج خود سے ملاقات کرلیں
چلو آج اپنے دل کی بھی سن لیں

بہت دوسروں کے لیے جی لیے ہم
رفیقوں کے ہمراہ بھی چل لیے ہم

ہیں دشواریاں ہی مری زندگی میں
مسائل بہت ہیں مری زندگی میں

دعا ہے خدا سے مری تو یہی اب
خطا تو مری معاف کردے مرے رب

مسائل کو میرے تو آسان کردے
مری زندگی کو بھی آسان کردے

■

مرسلہ :ڈاکٹر نثار بانو (نئی دہلی)

ڈراما

مشتاق کریمی

حامد حیات ہے

کردار : عبدالرحیم سر (مدرس)، شبانہ (بیٹی)، سائرہ (بھتیجی)، ریحان (بیٹا)۔

عبدالرحیم سر: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) السلام علیکم

سب بچے: وعلیکم السلام سر!

عبدالرحیم سر: آپ سب نے کل دیے ہوئے کام پورے کیے یا نہیں؟

سب بچے (ایک ساتھ): یس سر!

عبدالرحیم سر: ہونہہ! بیٹی شبانہ سترہ کا پہاڑہ یاد کرلیا؟

شبانہ: یس سر! ہمیں سزا کا خطرہ تھا سو ہم نے سترہ کا پہاڑہ یاد کرلیا۔

عبدالرحیم سر: ویری گڈ، بہت اچھے۔ کیوں میاں ریحان! آپ نے حمد یاد کرلی؟

ریحان: یس سر......

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری... زندگی اماں کی صورت ہو خدایا میری!

عبدالرحیم سر: بیٹے ریحان! اماں کی نہیں شمع کی، سمجھے۔ پیاری سائرہ بنا لیا دائرہ ......سرکل (عبدالرحیم سر نے ہوا میں انگلی سے دائرہ بناتے ہوئے پوچھا)

سائرہ: جی انکل بنا لیا سرکل (سائرہ نے بھی انگلی سے ہوا میں دائرہ بناتے ہوئے جواب دیا)

عبدالرحیم سر: اس کا مطلب یہ ہے کہ سب بچوں نے اپنے ٹیچر کا، اپنے ابو کا، اپنے چاچا کا، دوست کا کہا مانا ہے۔ مابدولت کیا انعام چاہیے۔

ریحان: کل کی طرح کوئی اچھی سی کہانی سنا دیجیے نا!

شبانہ: عید بھی قریب ہے۔ عید پر ہی کوئی پیاری سی کہانی سنا دیجیے۔

عبدالرحیم سر: چلیے بھئی آپ کی خواہش کے مطابق ایک بہت ہی پیاری یادگار کہانی سناتا ہوں۔

یہ کہانی میں جب بھی پڑھتا ہوں، آپ کی طرح بچہ بن جاتا ہوں۔ کہانی کا عنوان ہے عید گاہ۔ اس کے مصنف ہیں منشی پریم چند۔ بچو! ایک تھا حامد بڑا پیارا سا دلارا سا بچہ۔ نہ اس کی ماں زندہ تھی اور نہ ہی والد حیات تھے۔ بس ایک دادی تھی اس کی اور وہی دادی بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش کرتی تھی۔ دادی نے رمضان کے مہینے میں پائی پائی جوڑ کر اس کی عید کا لباس سلایا۔ پھر عید بھی آگئی۔ محلے کے سب بچے عیدگاہ جانے لگے۔ سب کی جیبوں میں پیسے تھے دادی نے بھی تین پیسے حامد کے ہاتھ میں تھما دیے۔

ریحان: صرف تین پیسے! (ریحان نے حیرت سے پوچھا)

عبدالرحیم سر: ہاں بھئی! اس زمانے میں تین پیسے بھی غنیمت تھے۔ ہاں تو وہ تین پیسے لے کر حامد عیدگاہ گیا۔ اس کے سارے دوست کھلونے خرید رہے تھے، مزیدار پکوان کھا رہے تھے مگر حامد کی نگاہیں عیدگاہ پر کسی اور چیز کو تلاش کررہی تھیں، پھر اس کی نظر پڑی دست پناہ پر۔

سائرہ: یہ دست پناہ کیا ہوتا ہے سر؟

عبدالرحیم سر: ہاں میں وہی بتانے جا رہا تھا دست پناہ یعنی چمٹا،

سمجھے۔تو حامد نے تین پیسے کا دست پناہ خرید لیا۔

شبانہ: یا اللہ! اس نے چمٹا خریدا! کیا اسے روٹیاں سینکنی تھیں؟

عبدالرحیم سر: ارے بھئی شبانہ تم بھی نا باتوں کا سلسلہ توڑ دیتی ہو۔ حامد نے وہ دست پناہ اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی دادی کے لیے خریدا تھا۔ دادی کے ہاتھ روٹیاں سینکتے وقت جل جاتے تھے نا اس لیے۔

سائرہ: یہ تو حامد نے بہت ہی اچھا کام کیا۔

عبدالرحیم سر: ہاں بیٹی! حامد نے بہت اچھا کام کیا مگر اب ایسے حامد، ایسے بچے نظر نہیں آتے۔ کاش وہ دن پھر لوٹ آئیں۔

(سر اداس چہرہ کے ساتھ گھر کی چھت کو گھورنے لگے)

(عید کا دن)

سب بچے آج بھی پڑھائی کے کمرے میں جمع ہیں اور بڑی بے چینی سے عبدالرحیم سر کا انتظار کر رہے ہیں.

عبدالرحیم سر: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) السلام علیکم! آپ سبھی کو عید کی بہت بہت مبارکباد۔ پیارے بچو! زندگی میں پہلی بار عید کی نماز نہ عیدگاہ میں پڑھی نہ ہی مسجد میں۔کورونا کی وجہ سے اپنے گھر میں ہی ادا کرنی پڑی مگر پھر بھی عید تو عید ہے۔خوشیوں کا دن، انعام کا دن، عیدی کا دن ہے۔ بتایئے اب کس کس کو کیا کیا عیدی چاہیے؟

ریحان: پیارے ابو جان، پہلے آپ اس کرسی پر بیٹھ جایئے، پھر آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ سامنے پھیلا دیجیے۔

عبدالرحیم سر: کوئی شرارت تو نہیں......؟ (سر نے ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے کہا)۔

شبانہ: کوئی شرارت ورارت نہیں ہے۔ سرپرائز ہے، بہت بڑا سرپرائز۔

عبدالرحیم سر: چلیے بھئی یہ لیجیے۔

(آنکھیں بند کر عبدالرحیم سر نے دونوں ہاتھ سامنے پھیلا دیے)

پہلے ان کے دائیں ہاتھ میں سائرہ نے دودھ کی طرح سفید رومال رکھ دیا۔ اسی اثنا میں ریحان نے دوسرے ہاتھ پر آہستہ سے عطر کی بوتل رکھ دی۔ ان چیزوں کے لمس نے عبدالرحیم سر کو چونکا دیا۔ ان کی آنکھیں دونوں تحائف پر جم گئیں اور آنسو کے قطرے عطر کی بوتل اور رومال کو بھگونے لگے۔ عبدالرحیم سر: یا اللہ! ان معصوم بچوں کے دل میں تو نے بات ڈال دی اور یہ اتنے قیمتی تحفے لے آئے، شکریہ جزاک اللہ بچو! مگر شبانہ تم کیوں خاموش کھڑی ہو؟

شبانہ: سر ہم نے اپنے ہاتھوں سے آپ کے لیے تحفہ بنایا ہے۔ یہ انوکھا بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔ ایک مرتبہ پھر اپنی آنکھیں بند کر لیجیے پلیز۔

سر نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

شبانہ دبے قدموں سے کرسی کے پیچھے جاتی ہے اور بڑی خاموشی سے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوا ماسک اپنے ابو (سر) کے منہ پر لگا دیتی ہے۔ماسک کے لمس سے عبدالرحیم سر کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔اس انوکھے تحفے سے ان کی آنکھیں پھر ڈبڈبا جاتی ہیں اور وہ زیر لب بڑبڑاتے ہیں۔

عبدالرحیم سر: میرے مولا وہ دن لوٹ آئے۔ حامد لوٹ آیا۔

(اتنا کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

[مارچ 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف ملاحظہ فرمائیں]

■

Mushtaq Karimi
Head Master, MTP Urdu High School
Paldhi Tal Dharangaon
Distt.: Jalgaon (Maharashtra)
Mob.: 9028222348

منظر 1

(پردہ اٹھتا ہے۔ ہدایت کار کی آمد)

ہدایت کار: (پورے اسٹیج کا معائنہ کرتے ہوئے چودہویں کے چاند کی طرح نمودار ہوا) گھنے جنگل میں ہنسی خوشی اور بھاگ دوڑ کا ماحول دیکھ کر جنگلی جانور حیران ہو رہے تھے۔ صبح سے رات ہونے تک خوشی اور طرب کی گونج چاروں سمت سنائی دیتی تھی۔ (مسکراتے ہوئے) اس گھنے جنگل میں خوشیوں کا اسکول جو کھل گیا تھا۔ اسکول جانے والوں کے طور طریقوں میں تیزی سے تبدیلی رونما ہونے لگی تھی۔ سبھی اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے لگے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ''بھالو'' کے اسکول میں پڑھنے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔

(پردہ گر جاتا ہے۔)

منظر 2

(ایک پیڑ کے نیچے مینڈک، سانپ، چوہا، بلی، شیر، بکری، ہاتھی، بندر، تتلی، لومڑی، سیار، خرگوش، گلہری اور ہرن پڑھ رہے ہیں۔ انھیں ''بھالو'' پڑھا رہا ہے۔)

بھالو: (بارعب آواز میں) سال بھر ہو گیا ہے۔ اب تمھارا امتحان ہونے والا ہے۔ تیار رہو۔

مینڈک: (سر کھجلاتے ہوئے) امتحان، یہ کیا بلا ہے؟

بھالو: (پہلے ہنستا ہے۔ پھر چہرے پر گھبراہٹ کا انداز لاتے ہوئے) یہ امتحان ہی تمھیں پاس اور فیل کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے سال بھر کیا سیکھا، کتنا سیکھا۔

خرگوش: (پریشان ہوتے ہوئے) لیکن ہم لوگ تو سمجھ ہی رہے ہیں کہ ہم روزانہ کچھ نہ کچھ یہاں نیا سیکھ رہے ہیں۔ تب بھلا اس امتحان کی کیا ضرورت ہے؟

بھالو: (ڈانٹتے ہوئے) چپ رہو۔ میں پڑھاتا ہوں اور تم پڑھتے ہو۔ میں سکھاتا ہوں اور تم سیکھتے ہو۔ اب وقت آ گیا ہے کہ سب جان لیں کہ تم میں سے اول کون ہے؟

چھپکلی: (چونکتے ہوئے) یہ اول کون ہے؟

بھالو: (چھپکلی کو آنکھ دکھاتے ہوئے) امتحان ہی یہ طے کرے گا کہ تم سبھوں میں کون سب سے زیادہ ہوشیار ہے؟ سال بھر اسکول میں پڑھایا گیا ہے۔ سکھایا گیا ہے۔ سمجھایا گیا ہے اب امتحان سے یہ طے ہوگا کہ تم کتنے عقلمند بن سکے ہو۔ اب گھر جاؤ اور امتحان کی تیاری کرو۔ کل تمھارا امتحان ہوگا۔

(اسکول کی گھنٹی بجنے کی آواز کے ساتھ سبھی (کردار نبھانے والے) دائیں بائیں سے اسٹیج کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ وہیں ہدایت کار کی آمد ہوتی ہے۔)

ہدایت کار: اسکول سے لوٹتے ہوئے سبھی سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے چہروں پر فکر کی لکیریں دوڑنے لگیں۔ ذہنی تناؤ

اور خوف کی وجہ سے سبھی ہنسنا گانا اور خوشی منانا بھول گئے۔ وہ بلا وجہ ایک دوسرے سے موازنہ کرنے لگے۔ ناامیدی اور گھبراہٹ سے ایک دوسرے سے دور جانے لگے۔ آج صبح تک جو خوشی اور موج مستی سے اسکول جا رہے تھے، وہ اسکول سے لوٹتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ کر گھبرا رہے تھے۔ امتحان سے جیسے ان کی آزادی ہی چھن گئی ہو۔ خوشیوں کا یہ اسکول ایک جھٹکے میں ڈر اور خوف کا اسکول بن گیا۔ ہر کوئی رات بھر اس دہشت سے سو نہیں سکا۔

(اسٹیج کے بائیں جانب چلا جاتا ہے۔)

منظر 3

(اسٹیج پر جانور۔ سب کے چہرے بجھے بجھے ہیں۔ اسٹیج کی ایک جانب لمبی دیوار ہے۔ دوسری طرف پیڑ ہے۔ ایک کنارے پر ایک بڑا پتھر رکھا ہوا ہے۔)

بھالو: (مسکراتے ہوئے) امتحان یہیں اسی میدان میں ہوگا۔ سبھی تیار رہیں! (دیوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے) اس دیوار پر جو سب سے پہلے چڑھے گا وہی اول مانا جائے گا اور کامیاب بھی۔

(سبھی دیوار کی جانب دوڑ پڑے۔ بندر گدھا اور سیار اچھلتے ہی رہ گئے۔ چھپکلی جھٹ سے دیوار پر چڑھ گئی۔)

چوہا: (اداس ہوکر) ہم جیسے اتنی اونچی دیوار پر کبھی نہیں چڑھ پائیں گے۔

بھالو: (پیڑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس پیڑ پر چڑھو۔ اڑنے والے پرندے پلک جھپکتے ہی پیڑ کی شاخوں پر پنکھ پھیلا کر بیٹھ گئے۔ ہرن، مینڈک جیسے جاندار اپنا سا منہ لے کر کھڑے رہ گئے۔)

بھالو: (ایک لمحہ کے لیے چیختا ہوا۔) میدان کا چار چکر لگاؤ۔ میں سو تک گنتی بولوں گا۔ گنتی پوری ہونے سے پہلے جو چار چکر لگائے گا، وہی اول مانا جائے گا۔ دوڑو (سبھی دوڑنے لگے۔) خرگوش، کتا سب سے آگے۔ کچھوا سب سے پیچھے رہ جاتا ہے۔)

بھالو: (جلد بول پڑتا ہے) میدان کے کنارے بڑا سا پتھر رکھا ہے۔ ہٹاؤ اسے۔

(سب نے کوشش کی۔ پتھر ٹس سے مس نہ ہوا۔ ہاتھی جھومتا ہوا آیا اور اس نے پتھر کو سونڈھ سے ہٹا دیا)۔

مدھومکھی: (جھلاتے ہوئے) میں اس کی مخالفت کرتی ہوں۔ ایسی پڑھائی سے تو جاہل رہ جانا بہتر ہے۔ ایسی پڑھائی، ایسا اسکول اور ایسے استاد مجھے منظور نہیں، جو درجہ میں اونچ نیچ کو بڑھاوا دیتے ہیں۔ اس لیے میں اس پڑھائی سے بیزار ہوں اور لعنت بھیجتی ہوں ایسی پڑھائی پر۔

تتلی: (جوش میں آکر) میں بھی اس امتحان کی مخالفت کرتی ہوں۔ ایک ایک کر کے سبھی بولنے لگے۔)

چوہا: میں بھی۔

بندر: میں بھی۔

سب ایک ساتھ: ہم سبھی (سب بھالو کی طرف دوڑے۔ بھالو گھبرایا۔ اس گھنے جنگل کا اسکول بند ہو گیا۔ اب سبھی اپنے تجربوں، مشاہدوں اور قدرتی مناظر سے سیکھنے لگے۔ اس کے بعد سے آج تک کسی بھی جنگل میں کوئی اسکول نہیں کھولا گیا)۔

(پردہ گرتا ہے)

■

Rizwan Mustafa
Raghepura, Beni Patti
Madhubani - 847223(Bihar)

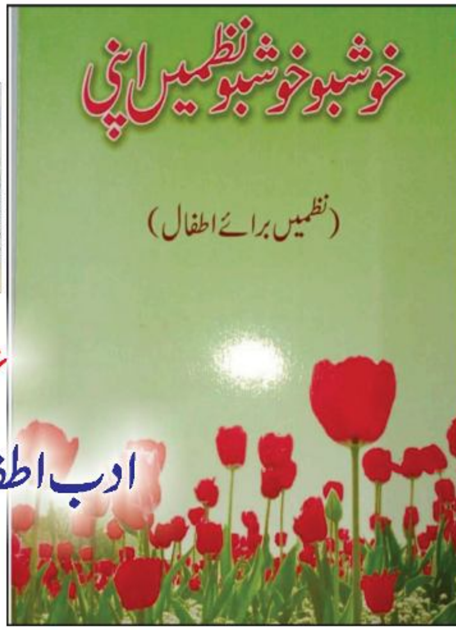

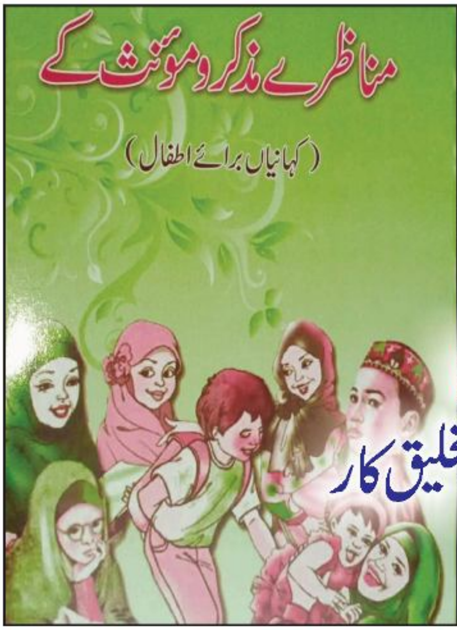

عطا عابدی

ادب اطفال کا نمائندہ تخلیق کار

خان رضوان

خان محمد رضوان کا تعلق صوبہ بہار کی مردم خیز زمین جہان آباد کے گاؤں سرین ٹھٹہ سے ہے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے، ایم اے اور دہلی یونیورسٹی سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اسعد بدایونی پر ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی ایک کتاب 'اخلاقی کہانیاں' کے عنوان سے مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نئی دہلی نے شائع کی ہے۔ ادب اطفال اور ادب کے دیگر موضوعات پر ان کے مضامین اکثر و بیشتر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

...بچے نہ صرف کسی قوم اور ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں بلکہ ملک کا مستقبل بھی ہوتے ہیں۔ بچوں کو ملک وملت کی ریڑھ کی ہڈی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کہ آزادی کے بعد سے ہنوز بچوں کی تعلیم وتربیت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی اور نہ ہی اس جانب کوئی مثبت اور ٹھوس قدم اٹھایا گیا۔ دیکھا جائے تو ہمارے ملک کا تعلیمی اور تربیتی نظام حد درجہ ناقص ہے۔ بچوں کی جو تعلیم گاہیں برسوں سے چل رہی ہیں۔ ان کا نظام تعلیم کسی طور اطمینان بخش اور کارگر نہیں ہے۔ جب کہ اس جانب خاطر خواہ توجہ دینے کی اشد ضرورت ہے۔

دراصل بچوں کے نظام تعلیم وتربیت سے یہاں مراد یہ ہے کہ ملک میں خصوصاً بچوں کی تعلیم اور ان کی تربیت کا ایسا نظام قائم کیا جائے جو خالصتاً بچوں کے لیے ہی ہو۔

ایسے بہت کم ادبا اور شعرا ہیں جنھوں نے تعلیم بالغان اور نصاب بالغان کے ساتھ ادب اطفال اور نصاب اطفال کو مرتب کرنے کی فکر اور بڑوں کے ساتھ بچوں کا ادب بھی لکھنے کی ضروری محسوس کی ہو۔ جب کہ ایک وقت وہ تھا جب اکبر الہ آبادی،

محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، تلوک چند محروم، اسماعیل میرٹھی، سید غلام رسول قوس، رسا ہمدانی گیاوی، اجتبیٰ رضوی، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، افضل حسین ایم اے ایل ٹی، ابوالمجاہد زاہد، متین طارق باغپتی، قرۃ العین حیدر، شوکت پردیسی، سیفی پریمی، جگن ناتھ آزاد اور شفیع الدین نیر وغیرہ نے بچوں کی اصلاح اور ان کی تربیت کی غرض سے مثبت طرز فکر کے ساتھ تدریسی نصاب، اصلاحی اور مقصدی نثر و نظم لکھ کر ادب اطفال کے سرمایے کو متمول کیا۔ مگر ان کے بعد ایک طویل وقفہ ایسا گزرا جس میں اس جانب پہلے کی طرح توجہ نہیں دی گئی، جس سے ہمارے علم کے سوتے سوکھنے لگے اور نظام تعلیم غیر موثر اور غیر مفید ثابت ہونے لگا جس کو دیکھتے ہوئے حامد اللہ افسر، اطہر پرویز، مولانا شبنم کمالی، سید ذکی احمد، ظفر کمالی اور عطا عابدی نے اس جانب خصوصی توجہ دی اور اپنا مقصد بچوں کا ادب تخلیق کرنا طے کیا اور اس میدان بے آب و گیاہ میں خشکی سے پانی نکالنے کا ہنر ایجاد کیا۔ آج ان معدودے چند ادبا کی فکر مندی ہی نئی نسلوں کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ان چند ادبا میں ایک اہم نام ڈاکٹر عطا عابدی کا ہے، جنھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس جانب توجہ دی ہے، اور ترجیحاً بچوں کا ادب لکھنا اپنا فرض منصبی جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس میدان میں بے حد سنجیدگی، دلجمعی اور امید و حوصلے کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ عطا عابدی اپنے ہم عصروں میں اس طور پر بھی منفرد اور ممتاز مقام رکھتے ہیں کہ انھوں نے تعلیم بالغان کے ساتھ ادب اطفال بھی تخلیق کیا ہے اور ہنوز اس جانب سرگرم سفر ہیں۔

خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کا ادب تخلیق کرتے وقت ان کے تقاضوں کا بھی خاص خیال رکھا ہے۔ جس کی گواہ ان کی کتابیں 'خوشبو خوشبو نظمیں' (نظم برائے اطفال) اور 'مناظرے مذکر و مونث کے' (کہانیاں برائے اطفال) ہیں۔

عطا عابدی کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھتے ہوئے نظم و نثر تحریر کی ہے جو کہ سب سے اہم اور ضروری بات ہے، ان کی دوسری خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کا مطالعہ بہت قریب اور گہرائی کے ساتھ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے بچوں کی نفسیات کو مقدم رکھ کر کہانیاں اور نظمیں کہی ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ تلمیح، استعارے، اشارے، کنائے اور لفظیات بھی بچوں کی ذہنی سطح اور فکری معیار کے مطابق ہوں۔ انھوں نے اس بات کا بھی خیال رکھا ہے کہ کلام میں ہلکے پھلکے اشارات، محاورات جو بچوں کے ذہن اور دلچسپی سے مناسبت رکھتے ہوں ان کو برتا جائے۔ اسی طرح انھوں نے ہلکی پھلکی عام بول چال کی لفظیات کا استعمال کیا ہے تاکہ بچوں کو بہ آسانی سمجھ میں آجائے۔ اور بچے بغیر کسی تردد کے چیزوں کو سمجھ سکیں۔ عطا عابدی کے یہاں مانوس لفظیات کا استعمال بھی خوب ہوا ہے۔ اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قصداً بچوں کو پیش نظر رکھ کر ارادتاً سہل اور شستہ لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ ان کی نظموں اور کہانیوں کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بچوں کی ذہنی استعداد، فکری معیار اور عمر کا خیال کرتے ہوئے اپنا اسلوب سادہ، انداز تخاطب دلچسپ اور طرز بیان مانوس رکھا ہے۔ تاکہ پانچویں کلاس سے دسویں کلاس تک کے بچے بہ آسانی دلجمعی اور لگن کے ساتھ پڑھ سکیں اور ادب سے اپنا رشتہ استوار کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عطا عابدی اپنے فن میں یکتا اور بے مثل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ کے دو شعر ملاحظہ کریں۔

جو ابتدا ہے جو انتہا ہے، وہی خدا ہے وہی خدا ہے
نبی نے جس کو خدا کہا ہے وہی خدا ہے وہی خدا ہے
جو واحد و بے نیاز ٹھہرا جو کافی و کارساز ٹھہرا
جو نیت دل بھی جانتا ہے، وہی خدا ہے وہی خدا ہے

حمد کے دونوں شعروں میں شاعر نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ جہاں خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا درس دیا ہے وہیں بچوں کو یہ بھی تعلیم دی ہے کہ وہ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، وہی سارے جہان کا مالک ہے، وہ ہمارے پوشیدہ رازوں کو بھی جانتا ہے، ساتھ ہی شاعر نے بڑی حکمت اور دانائی کا ثبوت پیش کرتے ہوئے عام بول چال کی زبان میں سہل اور مانوس لفظیات اور مانوس اندازِ تخاطب کے سہارے بچوں کو یہ ذہن نشین کرایا ہے کہ خدا ایک ہے اور وہی کارساز بھی ہے۔

اسی طرح شاعر نے اپنی نظم 'حسرت طیبہ' اور 'حج مبارک' جو کہ مختصر بحر میں کہی گئی نظمیں ہیں ان میں بھی بڑی سادگی، سلاست اور سہل انداز میں بچوں کو مکہ و مدینہ کی عظمت و اہمیت اور حاجیوں کو حج کا مرتبہ بتایا ہے۔

بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

اب تو سویا نصیب جگادے ہم کو مکہ مدینہ دکھادے
کچھ بھی کہنا نہیں ہے کسی سے یہ دعا ہے ہماری تجھی سے
(نظم: حسرت طیبہ)

رحمت حق ہوئی جلوہ گر حاجیو ہوگئی شام رشک سحر حاجیو
خود خدا جب ہوا راہ بر حاجیو کیوں نہ چومے قدم رہ گزر حاجیو
ایسے میں ہے تمھارا گزر حاجیو ہو مبارک یہ حج کا سفر حاجیو
(نظم: حج مبارک)

میں علم کا شیدائی / میں علم کا شیدائی / میں پھول ہوں مکتب کا / مکتب ہے چمن میرا / معصوم اداہوں میں / الفت ہے سخن میرا / میں علم کا شیدائی

(نظم: ایک طالب علم کے معمولات وعزائم)

محنت ہم اپنائیں گے آگے بڑھتے جائیں گے
اک دن منزل پائیں گے محنت زندہ باد، محنت زندہ باد
محنت سے ہم سب آباد محنت سے ہر دل ہے شاد
محنت کو رکھ ہردم یاد محنت زندہ باد، محنت زیادہ باد
(نظم: محنت زندہ باد)

مندجہ بالا نظموں کو اگر ہم بغور پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ شاعر نے سہل اور عام فہم اندازِ تخاطب کے ساتھ شستہ لفظیات کے سہارے بچوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ خواب دیکھنا اور آرزومند ہونا اچھی بات ہے مگر شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو پہلے اس لائق بنایا جائے، اپنے اندر عزم و حوصلہ پیدا کیا جائے، اپنی اصلاح کی جائے اور اپنے ارادوں کے ساتھ اپنی نیتوں اور اپنے افعال کی اصلاح بھی کی جائے۔ ساتھ ہی مکہ و مدینہ اور حج کی فضیلت اور اس کے مرتبے کو بھی واضح کیا ہے۔ علم اور محنت جیسے موضوعات کو برت کر شاعر نے بچوں کو ترغیب دلائی ہے کہ وہ علم حاصل کریں اور محنتی بنیں۔ شاعر نے اس میں اپنا اندازِ تخاطب اور طرزِ ادا جاذب، پرکشش اور نہایت ہی دلکش رکھا ہے جس کی وجہ سے ان نظموں کی اہمیت اور معنویت دوچند ہوگئی ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب کی دیگر نظمیں بھی بے حد عمدہ اور اصلاحی فکر و خیال کی ہیں۔ اسی طرح ان کی بچوں کے لیے کہانیوں کی کتاب 'مناظرے مذکر و مونث کے' بھی بہت ہی اہم اور معلوماتی ہے، جو کہ صرف اور صرف تربیت اور اصلاح کی غرض سے لکھی گئی ہے۔ جس میں مناظرے مذکر و مونث کے، تسلیمن چاچا، سبق اور کامیابی کی کنجی بے حد اہم اور کارگر کہانیاں ہیں۔ ان میں بچوں کی اصلاح کا وافر مقدار میں مواد موجود ہے۔

■

Rizwan Khan
D-307, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Dlehi - 110025
Mob.: 9717395472

کہانی

اشتہار اور روم ہیٹر

خورشید حیات

خورشید حیات کا تعلق گیا سے ہے۔ ریلوے کی ملازمت سے بہ حیثیت چیف کنٹرولر کوچنگ ساوتھ ایسٹ سینٹرل ریلوے ژون وابستہ تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز بچوں کی کہانیوں سے کیا۔ ان کی کہانیاں نور (رامپور)، پیام تعلیم (دہلی)، نوخیز (کولکاتا)، خوشبو (سہسرام)، شہد (گیا) میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ایڈز' ادبی حلقے میں بہت مقبول ہوا۔ ان کے تنقیدی مضامین 'لفظ تم بولتے کیوں ہو' کو خاطر خواہ پذیرائی ملی۔ 'پہاڑ، ندی، عورت' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ 'مردہ شہر میں دستک' زیر طبع ہے۔ ان کو کئی انعامات بھی مل چکے ہیں۔

اشتہار

جمعے کا دن تھا۔ راشد صاحب اپنے کمرے میں بیٹھے... نور کا تازہ شمارہ پڑھ رہے تھے۔ چُمن اخبار والا راشد صاحب کو روزنامہ اخبار 'چٹنی' دے گیا۔ راشد صاحب نے جلدی سے 'بچوں کی دنیا' کو الماری میں رکھا اور روزنامہ اخبار 'چٹنی' پڑھنے لگے۔

راشد صاحب کوئی قابل آدمی نہیں تھے۔ لیکن علم+نقل= ڈگری کے فارمولے سے کسی طرح، بی اے پاس ہو گئے تھے۔ اگر کوئی ان سے معمولی درخواست لکھنے کو کہہ دیتا تو وہ اس طرح غائب ہوتے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ ان دنوں وہ نوکری کی تلاش میں تھے۔ اخبار لے کر بیٹھتے تو سب سے پہلے اشتہارات کا کالم دیکھتے۔ مگر اس دن راشد صاحب کی نظر ایک خاص اشتہار پر اٹک گئی۔

"انوکھی ایجاد"

اس کے ذریعے آپ سبھی کو دیکھ سکتے ہیں لیکن آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ قیمت صرف پچاس روپئے اپنا آرڈر جلد ہی اس پتہ پر دیں۔

ایس کمار پاپڑ والا۔ گندی گلی، مدراس..."

اس اشتہار کو دیکھ کر راشد صاحب کا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ اپنے دل میں سوچنے لگے۔ میں سبھی کو دیکھ سکوں گا۔ لیکن مجھے کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔ جہاں جی چاہا چلے گئے۔ نہ ریل میں ٹکٹ کی ضرورت، نہ ہی کھانے میں پیسے خرچ، بھوک لگی کسی ہوٹل میں پہنچ گئے اور سنگھاڑے، پکوڑیاں، مٹھائیاں، جو چاہا کھا لیا۔ دیکھنے والا کون ہے؟۔ کرکٹ کا یہ میچ ہو رہا ہے اور

ٹکٹ ملنا مشکل ہے۔ مگر ہاں، ٹکٹ کی ضرورت ہی کیا ہے بے جھجک گیٹ کے اندر داخل ہو جایئے۔ دیکھنے والا کون ہے پھر تو، 'بچوں کی دنیا'، خریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ بک اسٹال پر گئے اور اٹھا کر چلے آئے، پوچھنے والا کون ہے؟۔ واہ رے ایس کمار پاپڑ والا، تمھارا جواب نہیں۔

دوسرے دن راشد صاحب ڈاکخانے میں جا کر پچاس روپے کا منی آرڈر ایس کمار نام دے آئے اور بہت بے صبری سے جادو کا انتظار کرنے لگے۔

وہ ہر روز ڈاکیے سے پوچھتے۔ ''کیوں بھائی، کوئی پارسل ہمارے نام نہیں آیا ہے؟'' ڈاکیہ کا نہیں، کا جواب سن کر وہ مایوس ہو جاتے۔

ایک دن ڈاکیے ایک پارسل راشد صاحب کو دے گیا۔ پارسل دیکھتے ہی انھوں نے فوراً سمجھ لیا کہ وہ ایس کمار پاپڑ والا کا بھیجا ہوا پارسل ہے۔ انھوں نے پارسل کے اوپر لپٹا ہوا سفید کپڑا قینچی سے کاٹا تو ایک لال رنگ کا ڈبہ دکھائی دیا۔ اسے کھولنے پر ایک اور ڈبہ فیتے سے بندھا ہوا نکلا۔ فیتے کو کھول کر انھوں نے ڈبہ اٹھایا...

اے..... اے..... یہ کیا؟ عورتوں کے اوڑھنے کا کالا برقعہ۔

راشد صاحب کی حالت دیکھنے لائق تھی۔ اچانک ان کی نظر ایک ہرے رنگ کے کاغذ پر پڑی۔ جس میں لکھا تھا؟

''اسے پہن کر آپ دوسروں کو دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن آپ کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر آپ کو اسے پہننے میں شرم محسوس ہو تو اپنی بیگم کو دیں۔''

لیکن راشد صاحب کیا کریں۔ انھیں نہ تو برقع پہننا پسند اور نہ ہی ابھی ان کی شادی ہوئی کہ برقع ان کی بیگم کے استعمال میں آجاتا...... خیر۔ ہم نے ان کو برقعے کے استعمال کے لیے ایک اچھا مشورہ دیا کہ وہ شادی (ضرورت رشتہ) کے اشتہار دیکھا کریں۔ لیکن انھوں نے کہا... ''بھئی اب کان پکڑا اشتہار دیکھنے سے۔''

روم ہیٹر

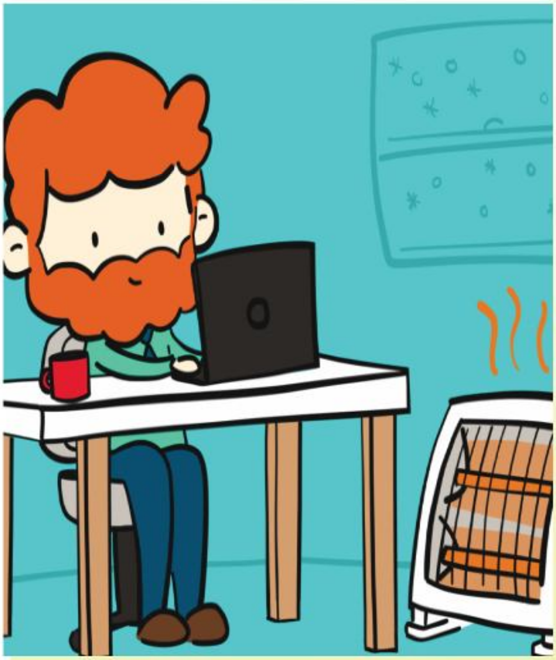

آخر میرا ساتھی شاہد گھر سے روم ہیٹر لے ہی آیا۔ میں روم ہیٹر دیکھ کر چونکا۔

یہ کیا جانتے نہیں ہوسٹل میں روم ہیٹر لانے کی اجازت نہیں ہے۔

''تو کیا ہوا؟''

''ہوگا کیا، وارڈن آئے گا، روم ہیٹر اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔''

''دیکھوں گا'' کہتے ہوئے شاہد نے روم ہیٹر کو الماری کے پاس رکھ دیا۔ پھر آرام سے پلگ لگا کر رات میں پڑھنے بیٹھ گیا۔

رات کے آٹھ بجے جب وارڈن صاحب اپنے دورے پر نکلے تو معمول کے مطابق کمرے میں داخل ہوئے۔ سامنے روم ہیٹر پر ان کی نظر پڑی اور پھر اسے دیکھ کر ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ بولے، یہ کیا ہے؟

''روم ہیٹر۔'' شاہد نے جواب دیا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں، مگر اسے یہاں کیوں لائے؟''

''سر، آج کل یہاں اتنی ٹھنڈک پڑتی ہے کہ روم ہیٹر کے بغیر پڑھائی ممکن نہیں۔ پھر اگر لحاف اوڑھ کر بستر پر بیٹھتا ہوں تو نیند—''

''بکواس بند کرو، جانتے نہیں روم ہیٹر ہوسٹل میں لانا منع ہے۔''

''معاف کیجیے گا سر، اگر آپ میری جگہ ہوتے تو آپ بھی یہی کرتے۔''

وارڈن صاحب یہ بات سن کر متاثر ہوئے اور کہہ کر چلے گئے کہ ابھی تم روم ہیٹر کا استعمال کرو۔ کل میں پرنسپل صاحب سے بات کروں گا۔

وارڈن صاحب کے سامنے کوئی قانون توڑے وہ یہ نہیں دیکھ سکتے۔ وہ کافی اصول پسند آدمی ہیں۔ وہ پندرہ دنوں تک سوچتے رہے، لیکن اس کا کوئی حل نہیں نکلا۔ جب ان سے یہ بات نہ بنی تو وہ پرنسپل صاحب کے پاس گئے۔

پرنسپل تو پہلے دس منٹ تک دل کھول کر ہنسے۔ پھر بولے۔ اجی چھوڑیے بھی ان لڑکوں کو روم ہیٹر کا استعمال کرنے دیجیے۔ ٹھنڈک بہت ہے۔

نہیں صاحب ایسے کیا ہوسکتا ہے۔ ہاسٹل کے ہر ایک قانون کے پیچھے کوئی نہ کوئی خاص وجہ ضرور ہوتی ہے۔

بہرحال، اس پر بعد میں سوچوں گا۔ ابھی آپ ایک درخواست لکھ کر یہاں چھوڑ جائیے۔

پرنسپل صاحب نے جب ایک ماہ تک جواب نہیں دیا تو وارڈن صاحب نے پھر تقاضہ کیا۔ پھر تو آئے دن ان کا چکر پرنسپل صاحب کے کمرے میں لگنے لگا۔ تنگ آکر پرنسپل نے یہ بات سکریٹری تک پہنچادی۔

بیس دنوں بعد سکریٹری نے یہ بات، ان آٹھ پروفیسروں تک پہنچا دی جنھوں نے ہاسٹل کے قانون بنائے تھے۔

پچیس دن بعد کمیٹی نے رپورٹ دی کہ اگر روم ہیٹر ضرررساں نہ ہو تو رہنے دیجیے۔ ورنہ ہٹا دیجیے۔

رپورٹ ایک ماہ تک پرنسپل کے روم میں پڑی رہی۔ وہاں سے وارڈن صاحب اٹھا کر لے آئے۔ پڑھتے ہی ہمارے کمرے کی طرف دوڑے۔ کمرے میں روم ہیٹر کو نہ دیکھ کر بولے ''روم ہیٹر کہاں ہے۔''

''سر، میں نے گھر میں چھوڑ دیا۔'' شاہد نے کہا۔

''کیوں؟'' وارڈن نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔

''سر، اب گرمی شروع ہوگئی ہے۔ اب روم ہیٹر کی نہیں پنکھے کی ضرورت ہے۔''

''بے وقوف تمھیں کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ سارے کیے کرائے پر تم نے پانی پھیر دیا۔ اب میں تمھارے خلاف کیسے ایکشن لوں؟ خیر کل، میں پرنسپل سے پھر بات کروں گا۔ کہتے ہوئے آندھی کی طرح چلے گئے۔

■

Khurshid Hayat
F-301, 3rd Floor, Sri Sai Nivas
Near J.J.Hospital, Torwa
Bilaspur- 495004 (Chattisgarh)
Mob: 6263331924

مثالی دوستی

آبیناز جان علی

آبیناز جان علی کا تعلق ماریشس سے ہے۔ وہ وہاں کے رابندرناتھ ٹیگور سیکنڈری اسکول میں اردو کی استاد ہیں اور نیشنل ریڈیو پر اردو کے پروگرام بھی پیش کرتی ہیں۔ مقتدر اخبارات و رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'پیچ و خم' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے جو وزارتِ فنون و ثقافت (ماریشس) کے تحت شائع ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پر بھی بہت متحرک ہیں اور ماریشس کے ادبی اور ثقافتی منظرنامے کے حوالے سے ان کی تحریریں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔

نور جہاں میری پڑوسن ہے۔ اس کا مکان لال رنگ کا ہے اور میرے مکان کا رنگ گلابی ہے۔ ہم ایک ہی اسکول اور ایک ہی جماعت میں پڑھتے ہیں۔ ہر روز ہم ساتھ میں اسکول کی بس سے اسکول جاتے ہیں اور ساتھ میں گھر واپس آتے ہیں۔ پیر کی شام کو نور جہاں اور میں پارک میں کھیلنے جاتے ہیں۔ ہم ساتھ میں جھولا جھولتے ہیں اور پکڑن پکڑائی کھیلتے ہیں۔ منگل کی شام کو ہم تالاب میں تیرنے جاتے ہیں۔ بدھ کی شام کو نور جہاں میرے گھر آتی ہے۔ ہم ساتھ میں ٹی وی پر کارٹون دیکھتے ہیں۔ جمعرات کو نور جہاں میرے ہی گھر پر کھانا کھاتی ہے کیونکہ اس کے والدین جمعرات کو کافی دیر تک دفتر میں کام کرتے ہیں اور وہ دیر رات کو گھر واپس آتے ہیں۔ جمعے کی شام، نور جہاں اور میں ساتھ میں اسکول کا کام کرتے ہیں۔ میں سنیچر کو نور جہاں کے گھر پر رہتی ہوں۔ ہم ٹی وی دیکھتے ہیں اور نور جہاں کی بلی مینو کے ساتھ بھی کھیلتے ہیں۔ ہم ساتھ میں کہانیوں کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ہم سائیکل چلاتے ہیں۔ اس

کے بعد ہم آئس کریم کھاتے ہیں۔ اتوار کو عموماً نور جہاں کے والدین اور میرے والدین ساتھ میں سمندر کے کنارے جاتے ہیں۔ نور جہاں اور میں ریت کا محل بناتے ہیں۔ ہم سمندر کے نمکین پانی میں اچھلتے کودتے ہیں۔ سمندر کی موجوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہم خوشی سے نہال ہوجاتے ہیں۔ نور جہاں کے ساتھ وقت کیسے گزر جاتا ہے، معلوم ہی نہیں پڑتا ہے۔

''آئینہ ہم اسی طرح ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ تم میری سب سے اچھی دوست ہو۔'' نور جہاں نے ایک دن سمندر کے کنارے میری طرف مسکراہٹ اچھال کر کہا۔ میں نے خوشی سے اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی پھینکا۔ اس پر نور جہاں کھل کھلا کر ہنس پڑی اور مجھ سے ذرا دور جاتے ہوئے وہ بھی میری طرف پانی پھینکتے ہوئے شور مچانے لگی۔

دوستی ایک خوبصورت پھول کی طرح ہوتی ہے۔ مالی پہلے پھول کے ان چھوٹے دانوں کو زمین میں بوتا ہے۔ ان دانوں کو روزانہ پانی دینے سے اور ان کا خیال رکھنے سے وہ پھول باغ کو بہت خوبصورت بنا دیتے ہیں۔ مضبوط دوستی کے لیے وقت اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر دونوں دوست ساتھ دیں تو دوستی بہت آگے جاسکتی ہے۔ نور جہاں بارہ سالوں سے میری بہترین دوست ہے۔ ہم نے بچپن سے آج تک ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ ہم ایک دوسرے کے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ میں نور جہاں سے کوئی بھی بات کہہ سکتی ہوں۔ نور جہاں بھی مجھ سے کوئی بھی چیز نہیں چھپاتی ہے۔ وہ میرے تمام راز جانتی ہے اور اس نے آج تک کسی سے میرے راز فاش نہیں کیے۔ میں کھل کر اپنی دوست سے اپنے دل کی باتیں بتا سکتی ہوں۔ وہ غور سے میری باتوں کو سنتی ہے اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ مجھ سے پیار سے بات کرتی ہے۔ اس نے کبھی میرا مذاق نہیں اڑایا۔ وہ اسکول کے کام کرنے میں میرا حوصلہ بڑھاتی ہے۔

ہم نے مشکل میں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ جب میں کسی تکلیف یا پریشانی میں ہوتی ہوں تو نور جہاں کبھی مجھ سے منہ نہیں موڑتی۔ ایک بار سڑک حادثے میں میری بلّی کی موت ہوگئی تھی۔ میں بہت اداس ہوگئی اور بہت روئی تھی۔ میں نے دو دنوں تک کھانا نہیں کھایا تھا۔ اس وقت نور جہاں نے مجھے سہارا دیا تھا۔ اس نے میرے آنسو پونچھے اور مجھے گلے لگایا تھا۔ نور جہاں نے مجھے اس صدمے سے باہر نکلنے میں مدد کی تھی۔ نور جہاں ریاضی کے کام میں بھی میری مدد کرتی ہے۔ اس کے علاوہ نور جہاں اور میں ساتھ میں کھیلتے ہیں اور خوشیاں مناتے ہیں۔ نور جہاں میری پسند اور ناپسند سے واقف ہے۔ میری دوست مجھے صحیح مشورے دیتی ہے۔ وہ سچی بات کہنے سے خوف نہیں کھاتی ہے۔

''آئینہ۔ تم پر یہ قمیص اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ تم پر نیلا رنگ زیادہ اچھا لگتا ہے۔'' میں نور جہاں کی رائے پر سنجیدگی سے غور بھی کرتی ہوں۔

ہمارے درمیان کبھی کوئی کڑواہٹ زیادہ دیر تک نہیں رہتی ہے۔ ایک بار میں نے غلطی سے نور جہاں کی ڈریس پر پیپسی گرا دی تھی۔ اس کی قیمتی ڈریس پر ایک بدنما داغ لگ گیا تھا۔ نور جہاں کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''مجھے معاف کردو نور جہاں۔ معلوم نہیں یہ پیپسی کیسے گر گئی۔ میں نے دھیان نہیں دیا تھا۔''

نور جہاں کا مایوس چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ ''میری امی نے لندن سے یہ ڈریس خریدی تھی۔ مجھے بہت پسند تھی۔ اب میں باہر جاتے وقت یہ ڈریس نہیں

پہن پاؤں گی۔"

"نور جہاں مجھے بہت افسوس ہے۔میں شرمندہ ہوں۔"

"ٹھیک ہے آمنہ۔ اب کیا کیا جاسکتا ہے؟" نور جہاں نے اپنا کندھا اچکایا۔

کچھ دن بعد سب پہلے کی طرح ہوگیا۔نور جہاں اس حادثے کو بھول گئی۔ میں ڈر گئی تھی کہ کہیں اس حادثے سے ہماری دوستی پر غلط اثر نہ پڑجائے۔لیکن نور جہاں مجھ پر کسی بھی حالت میں چلاتی نہیں ہے۔ ہم ہر وقت ایک دوسرے سے نرمی سے پیش آتے ہیں۔ہم ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں۔صبح صبح ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم مسکرا دیتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب مجھے اسکول میں مصوری کے مقابلے میں پہلا انعام ملا تھا تو نور جہاں نے مجھے مبارکباد پیش کی تھی۔ وہ میری کامیابی سے خوش ہوتی ہے۔جب نور جہاں کلاس میں اول آتی ہے تو میں نور جہاں کے لیے خوش ہوتی ہوں۔نور جہاں اور میں سکھ دکھ میں پاس رہتے ہیں۔میں نور جہاں کے تمام رشتے داروں کو جانتی ہوں اور وہ بھی میرے باقی دوستوں اور رشتے داروں سے مل چکی ہے۔نور جہاں نے مجھے نئے نئے کھیل بھی سکھائے ہیں۔نور جہاں اور میں اکثر اپنی چیزیں ایک دوسرے سے مانگتے ہیں اور پھر واپس بھی کرتے ہیں۔ اسکول میں جب نور جہاں اپنی پنسل تراش بھول جاتی ہے تو میں اسے اپنی پنسل دیتی ہوں۔ نور جہاں اکثر مجھ سے کہانیوں کی کتابیں مانگتی ہے اور پڑھنے کے بعد واپس بھی کر دیتی ہے۔

امی ہماری اس دوستی سے بہت خوش ہیں۔امّی کہتی ہیں کہ آپ کا دوست آپ کی شخصیت پر اثر کرتا ہے۔ ایک سچا دوست وفا دار ہوتا ہے۔ وہ ایماندار اور صادق بھی ہوتا ہے۔اچھی صحبت سے اچھے تجربے سامنے آتے ہیں۔ بری صحبت سے بچوں میں بری عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر آپ کا دوست چوری کرتا ہے تو اس کے قریب رہ کر آپ کو بھی چوری کی عادت لگ جائے گی۔ اگر وہ پڑھائی میں دلچسپی نہیں لیتا ہے تو آپ کا بھی پڑھائی میں من نہیں لگے گا۔ اگر آپ کا دوست سگریٹ پیتا ہے تو آپ کو بھی یہ بری لت لگ جائے گی۔

کبھی کبھی نور جہاں سائیکل چلانا چاہتی ہے اور میں ٹی وی دیکھنا چاہتی ہوں۔ ایسے وقت میں ہم بحث نہیں کرتے ہیں۔ہم آپس میں بات کرتے ہیں اور حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری دوستی میں کوئی رعب یا زبردستی نہیں ہے۔جب میں لوڈو کے کھیل میں ہار جاتی ہوں تو میں منہ نہیں بسورتی ہوں۔ جب نور جہاں ہار جاتی ہے تو وہ بھی غصہ نہیں کرتی ہے۔ کچھ چیزوں میں ہماری پسند اور ناپسند ایک نہیں ہیں۔ پھر بھی اس کی وجہ سے ہمارے درمیان کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ نور جہاں کو درخت پر چڑھنا پسند ہے اور مجھے اونچائی سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے ایک بار درخت پر چڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن میں پھسل گئی۔ اس کے بعد مجھ میں کبھی درخت پر چڑھنے کی ہمت نہیں آئی۔

ہم کلاس کے دوسرے بچوں سے بھی دوستی کرتے ہیں۔ نور جہاں دوسروں سے بات کرنے میں ذرا شرماتی ہے۔جب دوسرے بچے نور جہاں کو تنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو میں ان کو دور بھگاتی ہوں۔ میری موجودگی سے نور جہاں کو ہمت ملتی ہے۔ نور جہاں اور مجھے اندھیرے میں ڈر لگتا ہے۔ جب بجلی چلی جاتی ہے تو ہم اندھیرے میں زور سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بجلی کے واپس آنے کا انتظار کرتے ہیں۔

ایک دن خلاف معمول نور جہاں اسکول نہیں آئی۔گھر واپس آکر میں اس سے ملنے گئی۔اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ

نور جہاں کے والدین کو لندن میں نوکریاں ملی ہیں۔ اب نور جہاں لندن میں رہے گی اور وہیں پر اپنی تعلیم مکمل کرے گی۔ میں نور جہاں کو گلے لگا کر زار و قطار رونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میرے دل کا ایک حصّہ مجھ سے جدا ہو رہا تھا۔

میں اپنے والدین کے ساتھ نور جہاں کو ہوائی اڈے پر چھوڑنے گئی۔ ایک دوسرے کو الوداع کہتے وقت نور جہاں نے مجھ سے کہا: ''یہ دوستی میرے لیے بہت قیمتی ہے۔'' نور جہاں کی یہ باتیں میری آنکھوں میں آنسو لے آئیں۔

''تمھاری جیسی پیاری دوست مجھے کہیں نہیں مل سکتی نور جہاں۔''

امّی نے مجھے سنبھالا۔ میرے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

''آپ جہاں جائیں گے آپ کو دوست ملیں گے۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بہت جلدی دوستی ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ اپنے مطلب کے لیے آپ کے قریب آتے ہیں اور کچھ دوستوں کے ساتھ عمر بھر کا رشتہ رہتا ہے۔'' امّی نے سمجھایا۔

میں نے امّی سے کہا: ''اچھی دوستی کسی خزانے سے کم نہیں ہوتی ہے اور پرانے دوستوں سے بڑا کوئی خزانہ نہیں ہوتا۔''

ہوائی اڈے کی عمارت کے اندر جانے سے پہلے نور جہاں نے پلٹ کر دیکھا اور الوداع کہنے کے لیے اپنا ہاتھ ہلایا۔

■

Bibi Abeenaaz Janally
6th Mile SSR Street
Pamplemousses
Mauritius
0023059038384

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر............ بتاریخ............

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, Email.: magazines@ncpul.in

دستخط

ذاکر علی

کہانی

میں آزاد ہوں

آہل آج بہت خوش تھا۔ آخر آج اس کی سالگرہ تھی۔ اس موقع پر پورے گھر کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ امّی نے سالگرہ کی تقریب کے لیے ڈھیروں پکوان تیار کیے تھے۔ صبح سے کچن سے اٹھنے والی خوشبو نے اس کا دل خوشی سے بھر دیا تھا۔ شام کو بہت سے لوگ پارٹی میں آئے۔ پورا کمرہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ آہل نے سب کے سامنے کیک کاٹا۔ امّی نے اسے کیک کھلاتے ہوئے کہا، ''آج میرا بیٹا سات سال کا ہو گیا ہے'' اور پھر انھوں نے پیار سے آہل کا ماتھا چوما۔ آہل کو گھر میں آنے والے مہمانوں سے بہت سے تحفے ملے۔ بیٹ بال، فٹ بال، ماؤتھ آرگن، چاکلیٹ، پانی سے چلنے والا جہاز، بیٹری سے چلنے والا روبوٹ اور بہت کچھ۔

آہل کو جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی وہ ایک رنگ برنگی کتاب تھی۔ کتاب ہاتھ میں لے کر آہل سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور بیڈ پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔

وہ ایک کہانی کی کتاب تھی۔ ہر کہانی کے ساتھ رنگین تصویریں بھی بنی ہوئی تھیں۔ آہل کتاب کے صفحات پلٹنے لگا۔ پہلی کہانی کا عنوان تھا 'آزادی کا مول'۔ آہل نے کئی بار عنوان پڑھا مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔ دراصل لفظ 'آزادی' ہی اس کے گلے سے نہیں اتر رہا تھا۔ اور پھر جب آزادی کا مفہوم ہی معلوم نہ ہو تو اس کی قدر کیسے سمجھ میں آتی؟ آہل بستر سے اٹھا اور کتاب لے کر سیدھا پاپا کے پاس چلا گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا،

''پاپا، یہ آزادی کیا ہے؟''

پاپا نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر سمجھاتے ہوئے بولے، ''آزادی کا مطلب آزادی ہے۔ جیسے کچھ عرصے پہلے ہمارا ملک انگریزوں کا غلام تھا۔ وہ ہمیں مجبور کرتے تھے کہ ہم وہ سب ویسا ہی کریں جیسا وہ چاہیں لیکن اب ہم آزاد ہیں۔ آہل اپنے پاپا کی بات سن کر چونک گیا۔ وہ سر کھجلانے لگا۔ آہل کا رویہ دیکھ کر پاپا سب کچھ سمجھ گئے لیکن انھیں یہ بات سمجھ

میں نہیں آ رہی تھی کہ آہل کو آزادی کا مفہوم کیسے سمجھائیں۔

اچانک ان کی نظر سامنے بھاگتے ہوئے چوہے پر پڑی۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا ”دیکھو بیٹا یہ چوہا آزاد گھوم رہا ہے۔ اس پر کسی کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ تمام کام اپنی مرضی سے کرتا ہے۔ اسی کو آزادی کہتے ہیں۔“

”اچھا، تو یہ آزادی ہے؟“ آہل نے اپنے دل میں سوچا اور زبان سے کچھ بڑبڑاتے ہوئے بولا، ”آزادی کا مطلب ہے جو چاہو کرو۔“

آہل سمجھ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے سوال کیا، ”پاپا، کیا میں بھی آزاد ہوں؟“

”ہاں بیٹا ہمارے ملک میں سب آزاد ہیں۔“ پاپا نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا جواب دیا۔

آہل سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور کرسی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ آج زندگی کا ایک بڑا راز اس کے سامنے کھل گیا۔ اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا، 'ارے واہ، آزادی اتنی اچھی چیز ہے۔ مجھے پہلے سے معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اب میں خوب من موجی کروں گا۔ آخر میں آزاد ہوں۔

اور پھر فوراً آہل کا دھیان کچن میں رکھے رس گلّوں کی طرف چلا گیا۔ ماں نے پارٹی میں صرف دو کھانے کو دیے تھے۔ جب کہ اسے بہت زیادہ رس گلے چاہیے تھے۔ جب وہ آزاد ہے تو وہ رس گلہ کیوں نہیں کھا سکتا؟

آہل فوراً کچن میں آیا۔ امّی اس وقت وہاں نہیں تھیں۔ یہ دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا تو رس گلوں کا جار ملا۔ اسے بہت اونچائی پر رکھا ہوا تھا۔

آہل کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اگر اونچائی پر رکھا ہوا ہے تو کیا ہوا؟ یہ آٹے کا پیپا ہے۔ اس نے پیپا کھسکایا اور اس پر چڑھ گیا۔

رس گلوں کا جار بہت بھاری تھا۔ آہل کو جار اتارنے کے لیے کافی طاقت لگانی پڑی لیکن جار دراصل کافی بھاری تھا۔ بلکہ آہل کی توقع سے کہیں زیادہ۔ جار ہاتھ میں آتے ہی آہل کا توازن بگڑ گیا۔ اس نے خود پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن آخر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔ چھن کی آواز آئی اور جار زمین پر گر کر چکنا چور ہو گیا۔

آہل کا تو کاٹو خون نہیں آرہا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتا اس کی امی وہاں آ گئیں۔ ٹوٹا ہوا جار دیکھ کر ان کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ انھوں نے چیخ کر کہا، ”سارا فرش گندا کر دیا۔ رس گلے بھی چلے گئے۔“ اگر رس گلہ کھانے کی اتنی ہی خواہش تھی تو مجھ سے کیوں نہیں مانگا؟ بے چارہ آہل کیا جواب دیتا۔ وہ سمجھ گیا کہ اس وقت خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا لیکن وہ اندر ہی اندر اور چپکے چپکے دہرا رہا تھا، ”میں آزاد ہوں اور میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔“ امّی کو کام میں مصروف دیکھ کر آہل خاموشی سے وہاں سے چلا گیا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا موڈ خراب تو ہو ہی چکا تھا، اس لیے اس کا دل کسی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ انجانے میں اس کا ہاتھ ٹی وی کے ریموٹ تک جا پہنچا۔ ریموٹ ہاتھ میں لے کر وہ اس سے کھیلنے لگا۔ اچانک 'پاور' کا بٹن دبایا اور ٹی وی آن ہو گیا۔ اس وقت ٹی وی پر 'پوگو' چینل لگا ہوا تھا۔ ایک کامیڈی شو چل رہا تھا۔ آہل اس کا مزہ لینے لگا۔

ٹی وی دیکھتے ہوئے بمشکل دو منٹ ہوئے ہوں گے کہ اس کے بڑے بھائی وہاں آ گئے۔ انھوں نے اسے ڈانٹا اور کہا کیا تم ٹی وی کی آواز کو کم نہیں کر سکتے؟ میں اپنے امتحان کی تیاری کر رہا ہوں۔

اس نے زبردستی آہل کے ہاتھ سے ریموٹ چھین لیا اور ٹی وی بند کر دیا۔

آہل اس بار بھی خاموش رہا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ کیسی آزادی ہے؟ میں نہ تو رس گلا کھا سکتا ہوں اور نہ ہی اپنی مرضی سے ٹی وی دیکھ سکتا ہوں۔

تبھی آہل کی نظر ایک فٹ بال کی طرف گئی۔ وہ دروازے کے باہر کی طرف پڑی ہوئی تھی۔ اس نے فٹ بال کو غور سے دیکھا۔ آہل کو اپنا غصہ نکالنے کا اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اس نے کرسی سے اٹھ کر فٹ بال پر زوردار کک ماری۔

اسی وقت آہل کے والد وہاں سے گزر رہے تھے۔ موقع کی بات کریں یا آہل کی بدقسمتی، فٹ بال سیدھا جا کر پاپا کی کمر پر جا لگی۔ فٹ بال کی شاٹ اتنی زوردار تھی کہ پاپا فوراً آگے کی جانب جھک گئے۔ بے چارہ چشمہ تو یہ صدمہ برداشت ہی نہ کر سکا۔ وہ آنکھوں سے اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ لیکن یہ اتفاق کی بات تھی کہ وہ سینڈل پر گرا جس کی وجہ سے اس کے شیشے ٹوٹنے سے بچ گئے۔

آہل کے کاٹو تو خون نہیں۔ اس کی سٹی پٹی گم ہوگئی۔ اسے لگا کہ اب اس کی پٹائی ضرور ہو جائے گی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا کچھ نہیں ہوا۔ پاپا آہل کے پاس آئے اور بہت پیار سے بولے، کیا بات ہے آہل بیٹا؟ کیا تم کو کوئی پریشانی ہے؟

''نہیں، نہیں۔ میں تو... آہل کی بات منہ میں رہ گئی۔''

''نہیں، کچھ ہے؟'' پاپا نے آہل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا، ''ورنہ اس دھما چوکڑی کا کیا مطلب؟''

پاپا، میں کہاں دھما چوکڑی کر رہا ہوں؟ میں تو اپنی مرضی کے کام کر رہا تھا۔ آہل نے اپنی صفائی میں اپنے دل کی بات کہہ ڈالی اور پھر آپ نے ہی تو کہا تھا کہ میں آزاد ہوں...

پاپا نے آہل کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی ''بیٹے، آزادی کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تم جو چاہو کرو۔ تمھاری آزادی وہیں تک محدود ہے جس سے کسی دوسرے شخص کو کوئی تکلیف نہ ہو اور نہ وہ متاثر ہو۔ اگر تمھارے کام سے کسی شخص کو کوئی تکلیف ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی آزادی کی حد سے تجاوز کر رہے ہو اور اس کے لیے تمھیں سزا بھی مل سکتی ہے۔ سمجھے نا!

''جی سمجھ گیا...'' کہتے ہوئے آہل نے نیچے گرا ہوا چشمہ اٹھایا اور اسے پاپا کی آنکھوں پر لگا دیا۔

آہل کی سمجھداری دیکھ کر پاپا سارا غصہ بھول گئے، مسکرانے لگے اور انھوں نے اپنے بیٹے کو گود میں اٹھا لیا اور پیار سے چومنے لگے۔

■

Dr. Zakir Ali
7A-55, Vrindavan Colony, Raibareli Road
Lucknow-226029 (UP)
Mob.: 9935923334
Email: zakirlko@gmail.com

محبوب حسن

کہانی جنگل کی

بہت پرانی بات ہے۔ کسی ملک میں ایک گھنا جنگل تھا۔ اس جنگل کے سبھی جانور آپس میں مل جل کر رہتے تھے۔ ہاتھی، شیر، بھالو، خرگوش، مرغا، بلی، مور، چوہا، بندر، لومڑی، سانپ سب کو ایک دوسرے سے محبت تھی۔ مرغا روزانہ سورج نکلنے سے پہلے اپنی ککڑوکوں، ککڑوکوں کی صداؤں سے سب کو جگا دیتا۔ اس کی بانگ سن کر سبھی جانور جنگل کی سیر کرنے نکل پڑتے تھے۔ صبح صبح وہ ہری گھاس چرتے اور جھرنے کا میٹھا میٹھا پانی پیتے۔ ہاتھی درختوں کی شاخوں کو اپنی مضبوط سونڈ سے توڑ کر منھ میں ڈال لیتا تھا۔ چوہا آس پاس کے کھیتوں میں گھس جاتا اور کسانوں کے اناج سے اپنا پیٹ بھر لیتا۔ پرندوں کی خوش نما آوازوں، صبح بہنے والی ٹھنڈی ہواؤں اور رنگ برنگے پھول کی خشبو سے جنگل کا سارا ماحول سہانا ہو جاتا۔

جنگل میں شینخو نام کا ایک خرگوش تھا۔ اسے اپنی خوبصورتی پر بہت ناز تھا۔ اسی غرور میں وہ اکثر دوسرے جانوروں کو چڑاتا تھا۔ آم کے ایک بڑے درخت کے پاس بھولا نامی چوہا رہتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے بل سے نکلتا، شینخو اس کے پیچھے پڑ جاتا۔ وہ اسے کلو کلو کہہ کر پریشان کرتا تھا۔ بھولا کو اس کی یہ حرکت بالکل پسند نہ آتی۔ ایک شام جب بھولا زمین پر گرے پکا آم کھا رہا تھا، شینخو اسے دیکھتے ہی کہنے لگا:

''ارے او کالے چوہے! ! دیکھو میرے جسم پر کتنے خوبصورت اور سفید بال ہیں۔ ذرا چھو کر دیکھو میرا جسم کس قدر نازک اور ملائم ہے۔ میں تیز رفتار سے دوڑ بھی سکتا ہوں۔ لوگ پیار سے میرے ساتھ کھیلتے ہیں۔ کبھی تم نے خود کو آئینے میں دیکھا ہے؟ تمھارا رنگ کتنا گندا ہے! تم اتنے معمولی اور اوپر سے یہ لمبی پونچھ۔ توبہ توبہ! تم کتنے خراب اور بھدے لگتے ہو! کیا تمھیں شرم نہیں آتی !!

شینخو کی باتیں سن کر بے چارہ بھولا دل ہی دل میں بہت اداس ہو جاتا۔ اسے خرگوش کی باتوں سے بہت دکھ پہنچتا۔ لیکن وہ صبر سے کام لیتا۔ بھولا کو غمگین اور اداس دیکھ کر شینخو کو بے انتہا خوشی ہوتی۔ اسے اپنی حرکتوں پر کبھی شرمندگی نہیں ہوتی بلکہ وہ ٹھہاکے لگا کر ہنستا۔ دھیرے دھیرے شینخو کی بداخلاقی کی خبر جنگل میں ہر طرف پھیل گئی۔ شینخو کی شرارتیں سبھی کو ناگوار گزریں۔ ایک دن جنگل کے جانور شینخو کو سمجھانے کے لیے ایک جگہ جمع ہوئے۔

جب شینخو کو اس بات کی بھنک لگی تو وہ جھٹ سے بغل کی جھاڑی میں چھپ گیا۔ لیکن لومڑی نے اپنی چالاکی سے شینخو کو ڈھونڈ نکالا۔ اتنے سارے جانوروں کو اکٹھا دیکھ شینخو کے اوپر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ سب سے پہلے شیر نہایت غصے بھرے انداز میں بولا ''اے شرارتی خرگوش! مجھے خبر ملی ہے کہ تم بھولا کو بہت چڑاتے ہو۔ اس کی جسمانی کمزوریوں کا مذاق اڑاتے ہو۔ یاد رکھو! آئندہ ایسی حرکت کبھی نہ کرنا''

شیر کے خاموش ہوتے ہی ہاتھی اپنا بڑا سا کان ہلاتے ہوئے خرگوش سے کہا ''میری بات غور سے سنو کمبخت!! ہم سبھی کا جسم خدا نے بنایا ہے۔ اس میں ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ ہمیں خدا کی مخلوقات کا احترام کرنا چاہیے۔ کسی کو کمزور سمجھ کر اس کا مذاق اڑانا گناہ ہے۔ بلا شبہ خدا نے تمھیں خوبصورتی دی ہے اور تمھیں نرم و نازک جسم سے نوازا ہے۔ لیکن تمھاری یہ بری عادت خدا کی شان کے خلاف ہے۔''

تبھی اچانک پیپل کے پیڑ سے ایک عمر دراز بندر نیچے زمین پر دھم سے کودا۔ وہ شینخو کو سمجھاتے ہوئے بولا ''دیکھو میاں! یہ دنیا ایک دوسرے کی مدد سے چلتی ہے۔ ہمیں دوسروں کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی بداخلاقی سے کسی کا دل نہیں دکھانا چاہیے۔ ہمیں امید ہے کہ تم اب بھولا کو تنگ نہیں کروگے۔''

شینخو سبھی کی باتوں کو غور سے سن رہا تھا۔ جب مجمع خاموش ہوا تو وہ یکا یک خیں! خیں! کی آوازوں میں ہنستے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ شینخو کا یہ انداز جانوروں کو قطعی اچھا نہیں لگا۔ تھوڑی دیر بعد سبھی اپنے اپنے ٹھکانے کی جانب نکل پڑے۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ ایک روز جنگل میں ایک شکاری آیا۔ جنگلی جانور روزانہ کی طرح اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ شینخو بھی مستی بھرے انداز میں یہاں وہاں کلانچے بھر رہا تھا۔ تبھی اچانک شینخو پر اس شکاری کی نظر پڑ گئی۔ اسے دیکھتے ہی شکاری کے دل میں لالچ پیدا ہوگئی۔ شینخو کو پکڑنے کے لیے اس نے جال بچھا دیا۔

شکاری بھاگ دوڑ سے بہت تھک گیا تھا۔ پیڑ کے نیچے آرام کرتے ہی اسے گہری نیند آگئی ہے۔ وہ خراٹے مارتے ہوئے سو رہا تھا۔ اسی دوران شینخو اپنی شرارتوں کی وجہ سے شکاری کے جال میں پھنس گیا۔ خود کو اس مصیبت میں پھنسا دیکھ وہ بری طرح پریشان ہوا اٹھا۔ شینخو گھبراہٹ سے جال میں چاروں طرف کودنے پھاندنے لگا لیکن شینخو کے پاس اس مصیبت سے چھٹکارہ پانے کا کوئی چارہ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے بھولا کی نظر جال میں پھنسے شینخو پر پڑ گئی۔ وہ دبے پاؤں چپکے سے جال کے پاس آیا اور خرگوش سے کہا ''ارے شینخو! یہ کیسے ہوا؟ تم تو بہت مشکل میں پھنس گئے ہو! حوصلہ رکھو۔ میں کچھ کرتا ہوں۔''

بھولا کی باتیں سنتے ہی شینخو بہت شرمندہ ہوا۔ اسے اپنی ساری شرارتیں یاد آگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بھولا نے اپنے تیز تیز دانتوں سے شکاری کا جال کُتر ڈالا۔ جال کٹتے ہی شینخو آزاد ہوگیا۔ اس کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو چھلک پڑے۔ شینخو بھولا کو اپنی پیٹھ پر بیٹھا کر تیزی سے جنگل کی دوسری جانب نکل پڑا۔ اپنی غلط حرکتوں کے لیے شینخو نے جنگل کے سبھی جانوروں سے معافی مانگی۔ ساتھ ہی آئندہ کسی کے ساتھ بھی بد اخلاقی سے پیش نہ آنے کی قسم کھائی۔ اس واقعہ کے بعد بھولا اور شینخو گہرے دوست بن گئے۔

■

Dr Mahboob Hasan
Asst. Professor, Dept. of Urdu
Deen Dayal Upadhyay Gorakhpur
University, Gorakhpur- 273009 (UP)
Mob.: 8527818385

لالچی کوّے کا انجام

صبیحہ تزئین

صبیحہ تزئین کا تعلق کولکاتا سے ہے۔ انھوں نے کولکاتا یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ سردست بنگاباشی مارننگ کالج کولکاتا میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بین الاقوامی سمینار و ویبینار میں بھی شرکت کرتی رہی ہیں۔ بچوں کے لیے بھی کہانیاں لکھتی ہیں۔ نیا کھلونا (کولکاتا) اور 'بچوں کی دنیا' نئی دہلی میں ان کی کہانیاں شائع ہوچکی ہیں۔

ایک بہت ہی خوبصورت اور ہرا بھرا گاؤں تھا۔ یہاں کے سب لوگ آپس میں بہت میل ملاپ اور محبت سے رہتے تھے۔ وہ ہمیشہ مصیبت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے اور مدد کرتے، یہاں تک کہ وہاں کے چرند پرند بھی ایک دوسرے سے مانوس اور بے ضرر تھے۔ لیکن جیسا عام طور پر ہوتا ہے کہ ہر اچھی جگہ اور ماحول میں کوئی نہ کوئی فسادی اور مفادی ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح اس گاؤں کے پرانے برگد پر ایک بڑا کالا کوّا رہتا تھا، جو انسان اور جانور سب کو پریشان کرتا رہتا۔ ان کے سامنے سے کھانے کی چیزیں لے کر اڑ جاتا۔ گائے اور بکری کی پیٹھ پر بیٹھ کر انھیں ٹھونگیں مارتا اور وہ بے چاری اپنے سر اور دم سے اسے بھگانے کی کوشش کرتی رہتیں۔ اکثر وہ بچوں کے ہاتھ سے ان کی پسندیدہ چیزیں جھپٹ کر اڑ جاتا اور درخت پر بیٹھ کر کھاتا رہتا اور نیچے بچے روتے رہتے۔

اس گاؤں میں بہت سے پیڑ پودے تھے اور ان میں سے ایک درخت پر ایک گھونسلا تھا، جس میں ایک خوبصورت چڑیا اور چڑے کا جوڑا رہا کرتا تھا۔ ان کا ایک پیارا سا بچہ بھی تھا جو ابھی ابھی انڈے سے نکلا تھا۔ وہ بھی بہت خوبصورت تھا مگر ابھی کمزور تھا۔ چڑا اور چڑی باری باری اڑ کر جاتے اور اپنی چونچ میں بچے کے لیے دانہ چن کر لاتے اور اپنے بچے کی چونچ میں ڈالتے تاکہ وہ بھی جلدی جلدی بڑا ہوجائے اور اڑنے لگے۔ ایک دن چڑیا دانہ لانے گئی تو اسے آنے میں بہت دیر ہوگئی۔ کافی انتظار کے بعد یہ دیکھنے کے لیے کہ چڑیا ابھی تک کیوں نہیں آئی چڑا بھی گھونسلے سے باہر اڑ گیا۔ اس کے پیچھے وہ چھوٹا سا بچہ بھی نکلا لیکن وہ تو ابھی بہت چھوٹا تھا اور اسے اڑنا بھی نہیں آتا تھا اس لیے وہ اپنے گھونسلے سے نکلتے ہی لڑھک کر زمین پر گر گیا۔ اب وہ بے چارہ زمین پر پڑا تھا۔ اس کا گھر

درخت پر تھا۔ وہ اڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب وہ اپنے گھر کیسے جائے؟ وہ ڈر گیا اور چیں چیں کرنے لگا۔ اتنے میں چڑیا واپس آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ بچہ گھونسلے میں نہیں ہے بلکہ زمین پر گرا ہوا ہے اور مدد کے لیے ماں باپ کو بلا رہا ہے۔ چڑیا بھی اس کے پاس آ کر چیں چیں کرنے لگی۔ لیکن وہ بھی اس کو اٹھا کر گھونسلے تک نہیں لے جاسکتی تھی۔ دونوں مجبوری اور پریشانی میں شور مچا رہے تھے کہ کوئی مدد کر دے۔

چیں چیں کا شور سن کر 'کوا' ان کے قریب آ گیا اور زمین پر بچے کو گرا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اِدھر اُدھر پھدکنے لگا۔ چڑیا اس کا ارادہ بھانپ گئی۔ وہ کسی صورت اپنے بچے کو بچانا چاہتی تھی۔ وہ زور زور سے شور کرنے لگی۔

کوا آہستہ آہستہ اس کے پاس گیا اور بھولا بن کر پوچھنے لگا ''کیا ہوا بہن؟ بڑی پریشان لگ رہی ہو۔'' چڑیا روہانسی ہو کر بولی ''میرا بچہ گھونسلے سے گر گیا ہے، اور میں واپس اسے گھونسلے تک نہیں لے جاسکتی ہوں...... بتاؤ میں کیا کروں؟ ایسے تو میرا بچہ مر جائے گا۔''

''میں کچھ مدد کروں؟'' کوّے نے ہمدردی دکھائی۔ چڑیا بولی ''آپ کیسے مدد کر پائیں گے؟ میرا گھونسلا تو درخت کی شاخوں کے بیچ میں ہے، آپ وہاں کیسے پہنچ پائیں گے؟'' کوّے نے کہا ''میں اسے اپنی چونچ میں اٹھا کر اڑ جاؤں گا اور آپ کے گھونسلے میں رکھ دوں گا، کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی، مجھ پر بھروسہ رکھو۔'' چڑیا جانتی تھی یہ 'کوا' تو بہت چالاک ہے ضرور نقصان پہنچائے گا، اس نے کچھ سوچا پھر کہا ''آپ بہت اچھے ہیں، آپ میری مدد کو تیار ہیں، لیکن ابھی آپ کی چونچ میں بہت سی مٹی لگی ہوئی ہے پہلے آپ اسے دھو لیجیے تاکہ بچے کو اٹھاتے وقت کوئی دقت نہ ہو'' ...... یہ سن کر کوا بہت خوش ہوا اور سوچنے لگا چڑیا بھی کتنی بھولی ہے خود مجھے کھانے سے پہلے منہ دھونے کو کہہ رہی ہے۔ ''اچھا میں منہ دھو کر ابھی آیا۔'' یہ کہہ کر کوا اڑا اور سیدھا پنہاری کے پاس پہنچا اور کہا ''پنہاری پنہاری، تم پنہاری داس ہم کاگ داس، دو پنلا، دھوئے چونچلا، کھائے چڑی کا چیچڑا پھٹکارے چونچ۔'' پنہاری تو جانتا تھا کہ یہ بڑا بدمعاش کوا ہے اس نے اسے ٹالنے کو کہہ دیا کہ پانی تو ہے مگر برتن نہیں ہے۔ کس میں لے جاؤ گے؟ جاؤ پہلے کمہار سے کوئی برتن یا گھڑا لے کر آؤ۔'' 'اچھا' کہہ کر کوا وہاں سے اڑا اور سیدھا کمہار کے پاس پہنچا اور کہا ''کمہار، کمہار، تم کمہار داس ہم کاگ داس، دو گھڑلا، بھرے پنلا، دھوئے چونچلا، کھائے چڑی کا چیچڑا پھٹکارے چونچ۔'' کمہار اس گاؤں کا بہت پرانا رہنے والا تھا اور سب کو جانتا پہچانتا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ کسی نے کوے کو ٹالنے کے لیے میرے پاس بھیجا ہے۔ اس نے کوے سے کہا ''ارے او بھائی! کاگ داس، میں گھڑا کہاں سے دوں۔ میرے پاس تو برتن بنانے کی مٹی ختم ہوگئی ہے اگر تم کہیں سے مٹی لا کر دے دو تو میں فوراً گھڑا بنا کر تمھیں دے دوں گا، اور تم پانی بھر لینا۔'' اچھا ٹھیک ہے، یہ کہہ کر کوا وہاں سے اڑا اور سیدھا ایک کسان کے پاس پہنچا جو ابھی ابھی اپنے کھیت سے واپس آیا تھا۔ کوے نے بڑے جوش سے کہنا شروع کیا ''کسان، کسان، تم کسان داس ہم کاگ داس، دو مٹلا، بنے گھڑلا، بھرے پنلا، دھوئے چونچلا، کھائے چڑی کا چیچڑا پھٹکارے چونچ۔'' کسان بہت تھکا ہوا آیا تھا اور پھر سے کھیت میں جانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے اس نے کہا کہ ہاں مٹی تو بہت ہے اور میں تمھیں دے دوں گا مگر میرے پاس مٹی کھودنے کے لیے کدال نہیں ہے۔ اگر تم کہیں سے مجھے کدال لا دو تو میں تمھیں مٹی نکال کر دے دوں گا، اور تمھارا برتن بن جائے گا اور تم پانی بھر سکو گے۔'' کوا کو لگا کہ اب جلد میری خواہش پوری ہو جائے گی۔ یہ سوچ کر وہ پھر

سے اڑا لیکن لوہار کی دکان گاؤں کے بالکل دوسری طرف تھی اور اتنی دیر سے اڑتے اڑتے کوا تھک گیا تھا مگر اس کا جوش کم نہیں ہوا تھا، آخر کار وہ کسی طرح لوہار کے پاس پہنچا اور بولا ......''لوہار، لوہار، تم لوہار داس ہم کاگ داس، دو کدلا، لائے مٹلا، بنے گھڑلا، بھرے پنلا، دھوئے چونچلا، کھائے چڑی کا چیچڑا اپھٹکارے چونچ۔'' لوہار بہت ہی بدمزاج اور غصہ ور آدمی تھا۔ پھر وہ دن بھر گرم بھٹی کے سامنے بیٹھ کر اوزار بنا بنا کر اوب گیا تھا۔ کوے کی بات سن کر اسے غصہ آیا۔ وہ اس کوے کی چالاکی اور بدمعاشی سے واقف تھا اور چاہتا تھا کہ اس کوے کو سبق سکھایا جائے۔ اس نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بڑی رسانیت سے کہا ''اے کاگ داس ابھی ابھی تو میری بھٹی بجھی ہے اور میرے پاس آگ جلانے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہے، ہاں اگر تم کہیں سے آگ لا دو تو میں بھٹی جلا کر تمھارے لیے کدال بنا دوں گا۔'' کوا تھک چکا تھا مگر اپنی منزل اتنے قریب دیکھ کر وہ ہار ماننا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ وہاں سے اڑا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پورے گاؤں کا چکر لگا لیا تب اسے ایک بھٹیارن کے چولہے میں آگ نظر آئی اور وہ وہاں اتر گیا۔ بھٹیارن سمجھی یہ میرے بھنے ہوئے چنے اور مکئی کھانے آیا ہے۔ وہ ایک لکڑی کا ڈنڈا اٹھا کر اسے بھگانے لگی، کوا اِدھر اُدھر بھاگنے لگا پھر بولا: ''بھٹیارن، بھٹیارن تم بھٹیارن داس، ہم کاگ داس، دو اگلا، بنے کدلا، کھدے مٹلا، بنے گھڑلا، بھرے پنلا، دھوئے چونچلا، کھائے چڑی کا چیچڑا اپھٹکارے چونچ۔''

بھٹیارن کوے سے بہت پریشان رہتی تھی کیونکہ وہ آئے دن اس کے چنے اور مونگ پھلی لے کر بھاگ جایا کرتا تھا۔ اس نے سوچا آج اچھا موقع ہے اسے سبق سکھایا جائے اور یہ خود ہی اپنے لیے سزا مانگ رہا ہے تو مجھے کیا...... اس نے کوے سے کہا، ارے او کاگ داس آؤ میں تمھیں آگ دیتی ہوں۔ یہ کہہ کر اپنے چولہے سے ایک جلتی ہوئی لکڑی نکالی اور کوے کو دے دی، وہ اپنی کامیابی اور چالاکی پر بڑا خوش تھا۔ شام ہونے لگی تھی، دھوپ ڈھل رہی تھی، ہوا چل رہی تھی اور وہ اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ لکڑی جلتے جلتے اس کی چونچ تک پہنچ گئی ہے اور اب اس کی چونچ بھی جلنے لگی ہے۔ اس نے گھبرا کر وہ لکڑی اپنے پنجوں میں پکڑ لی مگر فوراً ہی اس کے دونوں پنجے جلنے لگے اور ہوا کی وجہ سے آگ اس کے پروں تک پہنچ گئی اور اس کے پر بھی جلنے لگے۔ لکڑی کا وہ ٹکڑا اس کی پکڑ سے چھوٹ گیا اور ساتھ ہی ساتھ کوا ابھی جھلس کر زمین پر گر پڑا، اس کی چونچ، اس کے پنجے اور اس کے پر سب ہی جل چکے تھے اور وہ بھی چڑیا کے بچے کی طرح زمین پر بے بس پڑا ہوا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی اس کی مدد کرے اور اس کی تکلیف دور کرے...... لیکن جس جگہ وہ پڑا ہوا تھا وہاں دور دور تک بھی کوئی اس کی مدد کرنے والا نہیں تھا۔ اسے اپنی موت بہت قریب دکھائی دے رہی تھی اور بار بار اس کی آنکھوں میں چڑیا کا وہ ننھا سا معصوم بچہ نظر آ رہا تھا ساتھ ہی چڑیا کی بے بسی اور لاچاری یاد آ رہی تھی۔ وہ بار بار اپنی غلط خواہش اور اس کا دردناک انجام سوچ رہا تھا۔

تکلیف سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں، چونچ بھی جل چکی تھی اور وہ دل ہی دل میں کہے جا رہا تھا۔ نہ لائے اگلا، نہ بنے کدلا، نہ کھدے مٹلا، نہ بنے گھڑلا، نہ بھرے پنلا، نہ دھوئے چونچلا، نہ کھائے چڑی کا چیچڑا، نہ پھٹکاریں چونچ۔

(بچپن میں سنی ایک کہانی پر مبنی)

■

Sabiha Tazeen
G-58, Batti Kal
Garden Reach
Kolkata 700024
email: sabihatazeen1@gmail.com

صاحبہ فردوس

لال چھتری

سیاہ بادلوں سے مزین آسمان اپنا سینہ چیر کر دھرتی کو سیراب کر رہا تھا۔ سردی اس قدر تھی کہ لوگ اپنے اپنے گھر میں لحاف کے اندر دبکے پڑے تھے۔ دسمبر کے چھوٹے دن تھے مگر بارش ایسے برس رہی تھی جیسے جولائی کا مہینہ ہو۔ بارش دیکھ کر امن خوشی سے جھومنے لگی اور اپنی لال چھتری لے کر صحن میں جانا چاہتی تھی مگر امن کی امی سبرین نے اُسے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ وہ اِس بے موسم کی بارش میں باہر بالکل قدم نہ رکھے ورنہ بیمار پڑ جائے گی۔" اپنی امی کی تنبیہ پر امن منہ بسور کر رہ گئی جبکہ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اپنی لال چھتری لے کر صحن میں گھومے۔ سات سالہ امن کے ابو سلیم صاحب ایک بڑی فرم میں ملازمت کرتے تھے اور امن کی امی سبرین بیگم ہائی اسکول کی ٹیچر تھیں۔ جس کے باعث انھیں ہر آسائش مہیا تھی۔ پیسے کی فراوانی نے اکلوتی امن کو بے جا ضدی بنا دیا تھا۔ امن ایک دفعہ اپنے والدین کے ساتھ اپنے کزن کی سالگرہ میں گئی تو اُس نے اپنی ہم عمر لڑکی کو لال چھتری تھامے پورے ہال میں مٹک مٹک کر چلتے دیکھا تو امن نے وہیں گندے بچوں کی طرح منہ بسور کر رونا پیٹنا شروع کر دیا اور فرمائش کی کہ "مجھے بھی ویسی ہی لال چھتری چاہیے۔" ویسے بھی امن کو لال رنگ بہت عزیز تھا۔ اس کا اسکول بیگ، کمپاس باکس، ٹفن حتیٰ کہ اس کی وارڈروب بھی زیادہ تر لال رنگ کے کپڑوں

سے بھری تھی۔لال رنگ کے بارے میں اس کی دیوانگی کا اس کے والدین کو پتا تھا اس لیے اس کی یہ فرمائش بھی اس کے والد نے فوراً پوری کردی۔امن کو یوں کچھ دیر پہلے چھتری کے لیے ساری محفل میں تماشہ بنا دیکھ کر سبرین بیگم نے اُسے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

’’ہر وقت گندے بچوں کی طرح ضد کرنا اچھی بات نہیں ہے امن! ہمیشہ خود سے چھوٹے لوگوں کو دیکھ کر جیا جاتا ہے نا کہ اپنے سے بڑے لوگوں کو دیکھ کر۔‘‘ اپنی والدہ کی بات امن کے پلّے ذرا سی بھی نہیں پڑی وہ تو بس اپنی لال چھتری کو دیکھ کر خوش تھی۔اتنی خوش کہ رات کو وہ لال چھتری اپنے سراہانے لے کر سوئی تھی۔ اس کی معصوم سی حرکت دیکھ کر اس کے والدین کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے پھر اکثر ایسا ہونے لگا کہ وہ لال چھتری کو اپنے پاس ہی رکھا کرتی تھی۔

ایک دن کی بات ہے جب امن کو اسکول جانے میں تاخیر ہوگئی اور اسکول جلدی جانے کی ہڑبڑاہٹ میں وہ اپنی لال چھتری ساتھ لینا بھول گئی تھی مگر گھر سے اسکول کا آدھا راستہ طے کرنے کے بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنی سب سے قیمتی متاع اپنی لال چھتری گھر ہی بھول گئی ہے تو اس نے بے تحاشہ رونا شروع کردیا اس کا رونا دیکھ کر سلیم صاحب نے پوچھا۔

’’امن! کیا ہوا بیٹا آپ رو کیوں رہی ہو؟‘‘

’’ابو! میں اپنی چھتری بھول گئی۔‘‘ اس کی بات پر سلیم صاحب سمجھ گئے کہ جب تک وہ کار گھر کی طرف واپس نہ مڑے گی تب تک امن نے رونا بند نہیں کرے گی۔ بالآخر واپس گھر کی طرف موڑنا پڑی پھر جب اس نے اپنی چھتری ہاتھ میں تھامی تب اسے سکون ملا۔ اس دن سے لے کر امن نے ایک منٹ کے لیے بھی اپنی چھتری کو خود سے دور نہیں کیا تھا۔

ایسے ہی ایک دن کی بات ہے جب سبرین بیگم کی بہن اور ان کے ساتھ ان کی بیٹی مریم ان کے گھر کچھ دن کے قیام کے لیے آئی تھیں۔ امن اکلوتی تھی اس لیے اس کے مزاج میں شاہانہ پن تھا مگر جب کوئی اسے پسند آتا تو وہ اسے اپنے پلکوں پر بٹھا کر رکھا کرتی تھی۔ ایسے ہی اسے مریم بہت پسند آئی تھی مریم امن سے ایک سال بڑی ہونے کے باعث امن سے زیادہ سمجھدار تھی۔ وہ امن کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ امن کی اس سے بہت اچھی دوستی ہوچکی تھی۔ایک دن مریم امن کے ساتھ کھیل رہی تھی کھیل کھیل میں مریم کے ہاتھوں امن کی چھتری گر پڑی۔ امن نے جب اپنی چھتری کو بے دردی سے زمین پر گرا دیکھا تو طیش میں آگئی اور مریم کو دھکا دے دیا۔ اس کے دھکا دینے پر مریم زمین پر گر پڑی اور رونے لگی اور دوسری طرف امن نے بھی رو رو کر گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔اسے سمجھدار سی مریم پر اب کافی غصہ آرہا تھا جس نے اس کی چھتری سے چھیڑ چھاڑ کی تھی اس نے رو رو کر مریم سے دوستی بھی ختم کردی جس کے باعث مریم دوسرے دن ہی اپنی والدہ کے ساتھ اپنے گھر رخصت ہوگئی تھی۔ اس کی اِس حرکت پر سبرین بیگم نے اسے خوب ڈانٹا تھا مگر وہ اپنی چھتری کو ہاتھ میں تھامے ان کی ڈانٹ خاموشی سے سنتی رہی تھی۔

آج امن اور اس کے والدین اپنے رشتے دار کے گھر شادی میں جا رہے تھے۔ امن نے خوبصورت لال رنگ کا فراک زیب تن کیا تھا اور اپنے لال جوتے پیروں میں پہنے تھے آج بھی ہمیشہ کی طرح اُس کی لال چھتری ساتھ ہی تھی۔ وہ تینوں کار میں سوار شادی کی تقریب کے لیے گھر سے نکل چکے تھے مگر اچانک ہی بن موسم بادل آگئے تھے اور زور دار بارش شروع ہوگئی۔سلیم صاحب سے اتنی تیز بارش میں کار

چلائی نہیں جارہی تھی اس لیے انھوں نے اپنی گاڑی سڑک کے دوسرے کنارے روک دی۔ امن کار کی کھڑکی کا شیشہ کھولے موتی کی طرح زمین پر گرتے شفاف پانی کی بوندوں سے کھیل رہی تھی کبھی وہ بارش کے پانی کو اپنی ننھی سی مٹھی میں سمانے کی کوشش کرتی تو کبھی اپنی مٹھی میں جمع پانی کو باہر ہی اچھالنے لگی اس کی اس حرکت پر اس کی امی نے اس سے کہا۔

''امن بیٹا! ایسا نہ کریں آپ بیمار پڑ جائیں گی۔'' اپنی امی کی بات سن کر وہ فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''جی امی میں اب نہیں کھیلوں گی۔'' اچانک اس کی نظریں سڑک کے اس پار اس ہی کی ہم عمر لڑکی پر پڑیں جو پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھی اور بغیر کسی چھتری کے بارش کے پانی میں بھیگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر امن اپنی امی سے بولی۔

''امی وہ دیکھیں۔ وہ لڑکی بھی تو میری ہم عمر ہے وہ بھی تو بارش میں بھیگ رہی ہے۔ کیا وہ لڑکی بیمار نہیں پڑے گی؟'' اس کی بات پر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے سلیم صاحب اور پچھلی سیٹ پر بیٹھیں ہوئی سبرین بیگم باہر کی طرف متوجہ ہوئے۔ سلیم صاحب نے اس بچی کو دیکھا اور امن سے بولے۔

''امن اس بچے کے پاس شاید کوئی گھر نہیں ہے اور نا ہی آپ کی طرح چھتری ہے جس سے وہ اپنا بچاؤ کر سکے۔'' سلیم صاحب کی بات اس کے سمجھ میں نہیں آئی تو وہ دوبارہ بولی۔

''مگر ابو اس لڑکی کے پاس گھر اور چھتری کیوں نہیں ہے؟'' اب کے سبرین بیگم بولیں۔ کیونکہ ''بیٹا وہ غریب ہے اور شاید اس کے والدین بھی نہیں ہیں۔'' ان کی بات پر امن کے دل کو کچھ ہوا اس نے پھر سوال داغا۔

''امی غریب کسے کہتے ہیں؟'' سبرین بیگم جو اس کے سوالات سے تنگ آ چکی تھیں وہ کچھ اکتائے ہوئے لہجے میں بولیں۔

''بیٹا اللہ تعالی جنھیں کم پیسے دیتا ہے انھیں غریب کہتے ہیں۔'' ان کی بات سن کر امن کچھ دیر تک خاموش رہی پھر اس کی نظریں اپنی لال چھتری پر پڑیں تو وہ اپنے ابو سے بولی۔

''ابو! کیوں نہ ہم یہ چھتری اُس لڑکی کو دے دیں شاید اس کی کچھ مدد ہو جائے۔'' معصوم سی امن کی بات سن کر سلیم صاحب اور سبرین بیگم پہلے تو حیران ہوئے پھر مسکرائے۔ تبھی سلیم صاحب نے اُس سے کہا۔

''بیٹا آپ کو تو یہ چھتری بہت پسند ہے۔ کیا آپ اِس چھتری کے بغیر رہ پاؤ گی؟'' ان کی بات پر امن الجھن کا شکار ہو گئی اس نے ایک نظر اپنی لال چھتری پر ڈالی پھر ایک نظر اس لڑکی پر ڈالی جو بارش میں بھیگ رہی تھی پھر وہ سمجھداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔

''ہاں ابو مجھے اپنی یہ لال چھتری بہت پسند ہے مگر اس لڑکی کو مجھ سے زیادہ اِس کی ضرورت ہے۔'' پھر امن نے اپنی لال چھتری اس لڑکی کو دے دی اور وہ لڑکی احسان مند نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ آج امن نے اپنی سب سے عزیز چیز قربان کر کے غربت و افلاس کی ماری اپنی ہم عمر لڑکی کی مدد کی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔

پیارے بچو! نیک کام کے لیے کبھی کبھی ہمیں ہماری سب سے عزیز، سب سے پیاری چیزوں کی قربانی دے دینی چاہیے جیسے امن نے دی۔

■

Saheba Firdous D/o Mohammad Ismail
Anjangaon Surji, Shaniwara Peth
Amravati - 444705 (Maharashta)
Mob.: 7020753769

حقانی القاسمی

بچوں کا ڈائجسٹ

صلاح کار

پیارے بچو! مستقبل کو روشن اور کیریئر کو تابناک بنانے کے لیے بہت سی سطحوں پر رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر صحیح طور پر گائیڈنس نہ ملے تو منزلوں کی تلاش دشوار ہوجاتی ہے۔ شاید یہی سوچ کر بڑے لوگ بچوں کے تئیں بہت فکرمند رہتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کہانیوں کی شکل میں، کبھی شاعری کی صورت میں، کبھی مضمون کے پیرائے میں ایک ایسا نشانِ راہ مہیا کرتے ہیں جو مقصد کے حصول میں مفید اور معاون ثابت ہو۔ کتابیں اور رسالے دونوں ہی ایک ایسے نشان کی حیثیت رکھتے ہیں جس کی روشنی میں بچے اپنے مستقبل کا سفر بہ آسانی طے کر سکتے ہیں۔ کتابوں سے بچوں کو نئی سمت و رفتار کا پتہ چلتا ہے تو رسائل سے نئی نئی راہیں روشن ہوتی ہیں۔ ماضی میں بچوں کی ذہنی اور فکری تربیت کے لیے بہت سے رسالے شائع ہوتے رہے ہیں۔ بچوں کی کردار سازی میں ان رسالوں کا کردار بہت اہم رہا ہے۔ انہی رسالوں کو پڑھ کر بچے بڑے قلمکار بھی بنے ہیں۔ آج بھی برصغیر ہند و پاک سے بچوں کی ذہنی ترجیحات، مطالبات اور تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے رسالے شائع ہو رہے ہیں۔ ان رسالوں کا مقصد صرف اور صرف بچوں کی تفریح کے ساتھ ساتھ ذہنی اور فکری تعلیم و تربیت ہے۔ بچوں کا ڈائجسٹ ماہنامہ 'صلاح کار' نئی دہلی بھی ایک ایسا ہی رسالہ ہے جس میں بچوں کی ذہنی سطح اور دلچسپیوں کا پورا خیال رکھتے ہوئے مشمولات کا انتخاب کیا جاتا ہے جہاں چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے ذریعے بچوں کے ذہن میں مثبت اور صحت مند خیالات و جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہیں نظموں کے ذریعے انھیں زندگی کے آداب و اطوار سکھائے جاتے ہیں۔ مضامین کی صورت میں بچوں کی سیرت سازی کی کوشش کی جاتی ہے۔ نومبر 2021 کے شمارے میں بھی کچھ ایسی تحریریں ہیں جنھیں پڑھ کر نہ صرف بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ بند دروازے بھی کھلتے ہیں اور بہت کچھ نیا سیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ کچھ نئے الفاظ اور کچھ نئے خیالات سے بھی بچے روبرو ہوتے ہیں۔

آج دنیا کے بہت سارے کاموں کا انحصار انٹرنیٹ پر ہے اور اس کا استعمال زندگی کے لیے لازمی سا ہوگیا ہے۔ حامد علی اختر نے انٹرنیٹ کی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر اپنے اداریے میں قیو آر کوڈ کے حوالے سے اچھا اور معلوماتی اداریہ تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "رسالہ صلاح کار میں قیو آر کوڈ کا نیا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ جو بچے انٹرنیٹ کا استعمال کرتے ہیں ان کے لیے اس طرح کے ویڈیوز موجود ہوں جنھیں دیکھ کر وہ بہت کچھ اچھا سیکھ سکھیں۔ ان ویڈیوز میں تمام طرح کا مواد موجود ہے۔ کہانی، افسانے، شاعری، گھریلو نسخے، بیوٹی ٹپس۔ ان ویڈیوز کے قیو آر کوڈ بناتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ ان میں کسی طرح کی عریانیت، فحش، یا نازیبا تصاویر اور زبان استعمال نہ ہو اور یہ بچوں کے اخلاق و عادات کو بگاڑنے کا سبب نہ بنیں۔" یہ ایک مفید سلسلہ ہے۔ اس رسالے میں بہت عمدہ کہانیاں بھی ہیں جن میں زندگی کو کامیاب اور بہتر بنانے کے نسخے بھی ہیں۔ بچوں کی معلومات کے لیے بہت عمدہ تحریریں 'صلاح کار' میں شامل کی گئی ہیں۔ 'مگرمچھ' کے عنوان سے ایک تحریر ہے، دیکھیے کتنی اچھی معلومات دی گئی ہے "یہ رینگنے والا بڑا جانور ہے۔ زمین اور پانی دونوں جگہوں پر زندہ رہ سکتا ہے۔ اس لیے اسے جل تھلیا بھی کہتے ہیں۔ مگرمچھ پانی میں بہت زیادہ طاقتور ہوتا ہے، زمین پر اس کے چلنے کی رفتار

تیز نہیں ہوتی ہے۔ پانی میں تیزی اور آسانی کے ساتھ تیرنے لگتا ہے۔'' (مرسلہ: ابتسام فیاض ولیلے)

اسی طرح شتر مرغ کے بارے میں بھی بچوں کو بتایا گیا ہے کہ ''یہ دنیا کا واحد پرندہ ہے جو بڑے بڑے پَر ہونے کے باوجود فضا میں اُڑ نہیں سکتا لیکن زمین پر تیز رفتاری کے ساتھ دوڑ سکتا ہے۔'' (مہوش لطیف)

اس رسالے میں 'بزم صحت' کے عنوان سے ایک مخصوص کالم ہے۔ مریم شیخ نے 'مائیں بچوں کی صحت بخش غذاؤں سے دوستی کرائیں' عنوان سے اپنے مضمون میں بہت اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ اسی طرح اس کورونا کے عہد میں بچوں کی قوتِ مدافعت کو کیسے مضبوط کیا جائے اس کے حوالے سے کملا بدونی نے دودھ، دہی، انڈہ، تلسی، بیریز، اوٹ میل، شکر قندی، ہول گرین بریڈ، پی نٹ بٹر وغیرہ کا ذکر کیا ہے کہ جس کے استعمال سے بدن میں وٹامن C کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ بچوں کے لیے پہیلیاں بھی ہیں، لطیفے بھی ہیں، معما بھی ہے، انعامی مقابلے اور رنگ بھریے بھی ہے۔ یہ سلسلے بچوں کو بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیل کھلاڑی کا بھی سلسلہ ہے۔ 'ادبی محفل' کے تحت جو تحریریں شامل کی گئی ہیں ان میں کئی بڑے اہم نام ہیں جو بچوں کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ جمیل جالبی، شبینہ فرشوری، جاوید اقبال، سیدہ زینب علی، ڈاکٹر عمران مشتاق، زکریا تامر یہ کچھ نام ہیں جن کی تخلیقات اس شمارے میں شامل ہیں۔ 'میڈم انجیلا' کے عنوان سے سالک دھامپوری کا ایک قسط وار سلسلہ بھی ہے جو بچوں کے اندر دلچسپی اور تجسس پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔ معروف شعرا کی شعری تخلیقات بھی ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بچوں کا ڈائجسٹ ماہنامہ 'صلاح کار' ایک مفید رسالہ ہے۔ بچوں کو اس نوع کے رسالے ضرور پڑھنے چاہئیں کیونکہ اس سے ان کی لفظیات اور فکریات

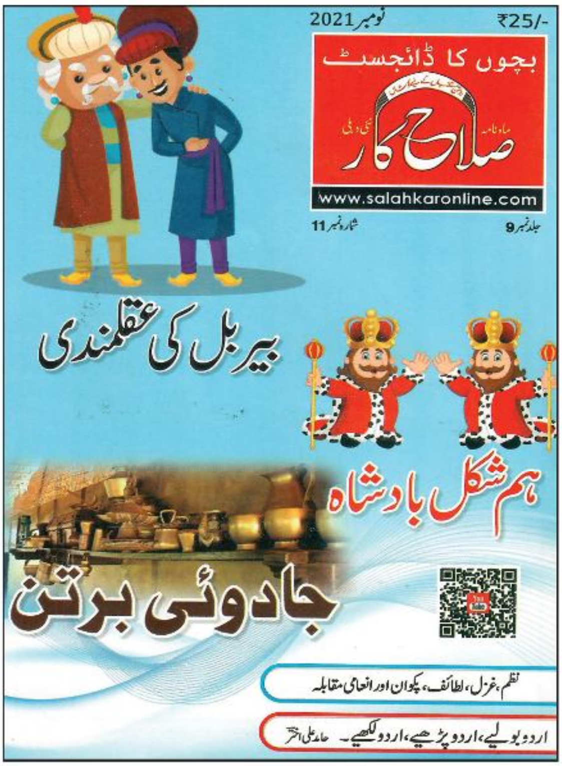

صلاح کار، ایڈیٹر: حامد علی اختر، صفحات: 82، قیمت: 25 روپے، ملنے کا پتہ: E-54، گراؤنڈ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، موبائل: 9810218638

میں اضافہ بھی ہوتا ہے اور معلومات اور اطلاعات کی ایک نئی دنیا سے بھی بچے روبرو ہوتے ہیں۔

ماہنامہ 'صلاح کار' کی ادارت کے فرائض مشہور شاعر حامد علی اختر انجام دیتے ہیں۔ اس کے سب ایڈیٹرس میں دلشاد حسین اصلاحی، محمد وسیم ندوی شامل ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے رسالے نے بہت جلد اپنی ایک پہچان بنالی ہے۔ روشن مستقبل کے لیے کوشاں ماہنامہ 'صلاح کار' یقینی طور پر بچوں تک اپنا مثبت پیغام پہنچانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ■

Haqqani Al-Qasmi
B-145/8, Fourth Floor, Thokar No.: 8
Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:9891726444

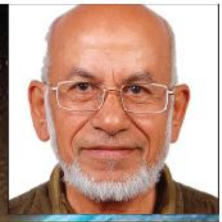

انیس الحسن صدیقی

خطرناک خرد سیارہ 'ڈائی ڈیموس' (Didymos) کی کہانی اس کی زبانی!

خطرناک خرد سیارہ 'ڈائی ڈیموس' (Didymos) کی کہانی اس کی زبانی!!!

میرے پیارے بچو! کیا آپ میری کہانی سن کر اسپیس سائنسداں[1] یا خلاباز[2] بننا پسند کرو گے؟

اگر آپ کے دل میں اپنی زندگی میں کچھ اچھا کام کرنے کی تمنا ہے تو پھر میری کہانی غور سے سنو! لیکن ایک شرط کے ساتھ کہ میرے بارے میں تمام جانکاری کی باتیں آپ اپنی کاپی پر ساتھ ساتھ لکھتے جاؤ گے تا کہ آپ کسی بھی امتحان میں مشکل سے مشکل سوالوں کا جواب دے سکو اور اپنے استادوں کو خوش کر سکو۔

بولو ہو نا تیار!

اچھا تو دھیان سے سنو!

میں بھی تمام خلائی اجرام[3] کی طرح ایک خلائی جرم ہوں۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ کی زمین جس پر آپ تمام انسان، چرند، پرند اور نباتات بستے ہیں۔ لیکن میری زمین پر کچھ بھی نہیں ہے، یہاں تک کہ ہوا پانی بھی نہیں ہے۔ میری زمین پر سوائے سخت چٹان کے جس کی ساخت اور بناوٹ آپ کی زمین کے سائنسداں ہی بتائیں گے کہ وہ کیا ہے؟ وہ بھی جب ان کو میری چٹان کا نمونہ ملے گا۔ جیسا کہ جاپان کے خلائی جہاز ہیا بوسا۔دوم نے خرد سیارہ ڈیگو کی کان کنی کر کے اس کا مادہ فروری 2019 میں زمین تک پہنچایا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کب پیدا ہوا تھا اور کس طرح پیدا ہوا تھا؟ بس اتنا ضرور جانتا ہوں کہ مجھے اپریل 1996 میں امریکہ کی یونیورسٹی آف ایریزونا کے اسپیس واچ پروجیکٹ کے تحت ڈاکٹر جو مونٹانی (Joe Montani) نے میری نشاندہی کی تھی۔

نومبر 2003 میں، جب خلا میں، میں سورج کے گرد اپنے مدار[4] میں گردش کرتا ہوا آپ کی زمین کے قریب پہنچا تو

دنیا کے سائنسداں مجھ سے ڈر گئے کہ کہیں یہ ہماری زمین کی کشش[5] کے تحت زمین سے نہ ٹکرا جائے۔ بھلا میں کیوں ٹکرانے لگا! اس وقت میں آپ کی زمین سے آپ کے چاند سے بھی بہت دور یعنی 71,80,000 کلو میٹر کی دوری پر تھی۔ تب ہی آپ کی دنیا کے ملک زیک ریپبلک کی آنڈریجو (Ondrejov) رصدگاہ[6] کے فلکیاتی ماہر ڈاکٹر پیٹر پراویک (Dr. Petr Pravec) نے مشاہدہ کر کے بتایا کہ میرا ایک قدرتی سیارچہ[7] ڈائیمورفوس (Dimorphos) بھی ہے جو میرے گرد گردش کر رہا ہے۔ اس لیے دنیا کے سائنسدانوں نے میرے اس جوڑے کو نظام ثنائی (Binary system) کا نام دیا۔ دنیا کے سائنسدانوں نے حساب لگا کر یہ بھی بتایا کہ میں آپ کی زمین کے نزدیک تقریباً 120 سال کے بعد دوبارہ ظاہر ہوں گا۔ سورج کے گرد میرا مدار آپ کی زمین کے مدار سے بہت ہی دور ہے۔ سورج سے آپ کی زمین کا اوسطاً فاصلہ ایک فلکیاتی یونٹ ہے جو کہ 14,96,00,000 کلو میٹر ہے۔ اس کے برعکس سورج سے میرا فاصلہ ایک سے 2.3 فلکیاتی یونٹ تک ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں میرا آپ کی زمین سے ٹکراؤ بہت ہی مشکل ہے۔ اس میں ڈرنے کی کوئی بات بالکل بھی نہیں ہے۔

سورج کے گرد آپ کی زمین 365 دنوں میں ایک چکر پورا کرتی ہے جسے آپ ایک سال کہتے ہیں۔ اس کے برعکس میں سورج کے گرد ایک چکر آپ کی زمین کے 2 سال ایک ماہ میں پورا کرتا ہوں۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ میں آپ کی زمین سے کتنا دور ہوں! لیکن پھر بھی آپ کے سائنسدانوں نے مجھے خطرناک خرد سیاروں کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔ خیر کوئی بات نہیں لیکن آپ تو مجھ سے بالکل بھی نہ ڈریں۔

میں تو اپنا نام بھی نہیں جانتا تھا! بھلا کرے آپ کی دنیا کے سیاروی سائنسداں ڈاکٹر کلیومینس سکانس (Dr. Kleomenis Tsiganis) جن کا تعلق ارسطو یونیورسٹی آف تھیسالونیکی (Aristotle University of Thessaloniki) سے ہے، انھوں نے میرا نام یونانی لفظ "Didymos" کے معنیٰ ہیں 'دوشکلوں والا' سے مطلب نکالا ہے۔

اب ذرا دل تھام کر میرے بارے میں اور بھی سنیئے!

یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ میرا جسم بالکل گول نہیں ہے اس لیے میری سطح 780 میٹر کے قریب آر پار ہے اور ہاں! میرے چاند ڈائیمورفوس کا قطر تو صرف 160 میٹر ہی ہے۔ اس کی شکل انسانی چہرے جیسے لگتی ہے۔ یہ میرا قدرتی جرم یعنی چاند اپنے مدار میں آپ کی زمین کے 11.9 گھنٹوں میں میرے گرد ایک چکر پورا کرتا ہے۔ بالکل آپ کی زمین اور چاند کی طرح میرا اور میرے چاند کے درمیان ایک جیسی ہی گردش ہے یعنی جس طرح آپ کے چاند کی ایک ہی طرف آپ کو اپنی زمین کی سطح سے دکھائی دیتی ہے اسی طرح میرے چاند کی بھی میری سطح سے اس کی ایک ہی طرف دکھائی دیتی ہے۔ یہ تو ایک اتفاق ہے۔ جی ہاں! میرا جسم آپ کی زمین اور چاند جیسا چٹانی ہے۔ کس چٹان کا بنا ہوا ہے یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ البتہ جب آپ بڑے ہو کر سائنسداں بنو گے تب میری اور چاند کی مٹی یعنی چٹان کا تجزیہ کرنا کہ میں کس دھات یا معدن سے بنا ہوا ہوں۔

یہ تو تھا میرے اور میرے چاند کے بارے میں مختصر سا تعارف۔

اب ذرا اور غور سے سنیئے کہ آپ کی دنیا کے سائنسداں مجھ پر اپنا تجربہ کر رہے ہیں جو کہ میرے لیے بہت ہی تکلیف والا ایک حادثہ ہو سکتا ہے۔ اس تجربے کے نتیجوں سے میں

بالکل بھی واقف نہیں ہوں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں ان کی دنیا کے لیے ایک خطرناک خرد سیارہ ہوں اور کبھی بھی آپ کی زمین سے ٹکرا سکتا ہوں۔ اس ٹکراؤ سے دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس لیے وہ مجھے اپنی جگہ سے ہٹانا چاہتے ہیں۔ تا کہ مستقبل میں ٹکراؤ کا خطرہ ٹل جائے۔ مجھ پر تجربہ کر کے وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ اپنے تجربے میں کامیاب بھی ہوں گے یا نہیں۔ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو اور دوسرے نزدیکی خرد سیارے جن کو خطرناک سمجھتے ہیں وہ ان کو ان کے راستے سے ہٹائیں گے۔ اگر کامیاب نہیں ہوئے تو کوئی اور حل سوچیں گے۔ کیونکہ ان کی دنیا ان کے لیے بہت ہی خوبصورت اور رہائش کے لیے بہت ہی موزوں ہے۔ ان کو دنیا کا بدل ابھی تک پوری کائنات میں کہیں بھی دکھائی نہیں دیا ہے۔

جی ہاں! تو میں یہ کہہ رہا ہوں کہ اس تجربے کے لیے آپ کی دنیا کی خلائی تنظیم ناسا نے 24 نومبر 2021 کو ایک فلکان۔9 (Falcon-9) نام کا راکٹ جس میں ایک مصنوعی سیارچہ ڈارٹ (Satellite DART) سوار تھا اپنے خلائی اسٹیشن مقام کیلیفورنیا سے ہندوستانی وقت کے مطابق ٹھیک 11.00 بجے صبح خلا کے لیے داغا تھا۔ اس راکٹ کے داغے جانے کے ٹھیک ایک گھنٹے بعد پہلی اسٹیج کا راکٹ علیحدہ ہو گیا اور دوسرے گھنٹے کے بعد دوسری اسٹیج کا راکٹ بھی علیحدہ ہو گیا اور مصنوعی سیارچہ ڈارٹ نے اپنے کیپسول سے باہر آ کر اپنے 28 فٹ لمبے شمسی پینل کھول دیے تا کہ وہ شمسی توانائی سے اپنا سفر شروع کر سکے۔ اس طرح اس مصنوعی سیارچہ ڈارٹ نے میری طرف اپنا خلائی سفر شروع کر دیا۔

ناسا کے ایڈمنسٹریٹر کا کہنا ہے کہ یہ تمام کارروائی بالکل فلم میکر بَروس ولی (Bruce Willi) کی فلم 'آرما گیڈان' (Armageddon) کی نقل ہے۔ جبکہ یہ فلم حقیقت نہیں بلکہ صرف ایک تصوراتی کہانی ہے۔ آپ کی دنیا والے بھی پہلے تصور کرتے ہیں اور پھر اس تصور کو حقیقت میں بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچے فلموں کے ذریعے زیادہ سیکھتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے یہ فلم دیکھی ہے یا نہیں۔ ہاں! البتہ امریکہ اور دوسرے ملکوں کے لوگوں نے یہ فلم بڑی ہی دلچسپی سے دیکھی تھی۔ یہ فلم بہت مشہور ہوئی تھی۔ اگر آپ نے یہ فلم نہیں دیکھی ہے تو اس فلم کو ضرور دیکھیں تا کہ آپ کو خلائی سفر کے بارے میں آسانی سے اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ کس طرح ہوتا ہے۔

ارے! میری کہانی کے درمیان میں یہ فلم کا ذکر آ گیا! خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا تو پھر سنیے:

یہ مصنوعی ڈارٹ سیارچہ خلا میں سفر کرتے ہوئے 26 ستمبر اور اکتوبر 2022 کے درمیان میرے قریب تقریباً 55 کلو میٹر میرے چاند ڈائمورفوس سے ٹکرانے سے دس دن پہلے پہنچے گا۔ وہ بھی اگر خیریت سے پہنچ گیا اور اس عرصے میں اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہوا کیونکہ سفر کے دوران اس کو خلا میں پڑے ہوئے حجر شہابی سے بچنا ہے۔ اگر وہ خلا میں پڑا ہوا حجر شہابی سے ٹکرا گیا تو وہیں نیست و نابود ہو جائے گا۔

اس کے سفر کے دوران ناسا کے تکنیکی ماہروں کی ٹیم اس کے سفر پر مستقل دن اور رات نظر رکھے ہوئے ہے اور اس کو خلا میں نیوی گیٹ کر رہی ہے تا کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ نہ ہو جائے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد وہ تب تک اپنے مدار میں میرے گرد گردش کرتا رہے گا۔ ناسا کے سائنسدانوں کی ٹیم پہلے اس سیارچے کی صحت کا معائنہ سیارچے پر نصب کیمرے کے ذریعے کرے گی اور پھر حالات دیکھ کر وقت کا تعین کرے گی۔ یہ سیارچہ میرے چاند ڈائمورفوس سے تقریباً 6 کلو میٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے ٹکرائے

گا۔اس سیارچے پر نصب کیمرہ ٹکرانے سے 20 سیکنڈ پہلے تک کی تصویریں آپ کی زمین پر ناسا کی ٹیم کو روانہ کرتا رہے گا۔ ٹکرانے کی کوئی بھی تصویر موصول نہیں ہوگی کیونکہ سیارچے کے ساتھ کیمرہ بھی ٹکرا کر چکنا چور ہوجائے گا۔

اگر ایسے ٹکراؤ کے ذریعے میرے چاند ڈائمورفوس کا مدار 73 سیکنڈ تک بڑھ جاتا ہے تو ناسا کے سائنسداں اس سے یہ نتیجہ نکالیں گے کہ مصنوعی سیارچہ ڈارٹ نے اپنا کام کامیابی سے انجام دیا ہے۔اب آپ 26 ستمبر اور اکتوبر 2022 تک انتظار کریں کہ کیا ہوتا ہے؟

میں سمجھتا ہوں کہ میری کہانی سن کر آپ ضرور اپنی توجہ مضمون سائنس اور ریاضی پر اور زیادہ کریں گے تاکہ آپ بھی ایک دن ہندوستانی خلائی ایجنسی اسرو کے سائنسداں یا تکنیکی ماہر بن کر دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کریں۔

اچھا! اب بہت دیر ہوگئی ہے اور آپ کو اپنا ہوم ورک بھی کرنا ہے۔بائے بائے!

حواشی

(1) اسپیس سائنسداں (Space scientist) وہ سائنسداں جو خلا یا خلا سے متعلق اجرام کی تحقیق کرتا ہو۔

(2) خلا باز یا نورود (Astronaugh) وہ تربیت یافتہ شخص یا عورت جو خلا میں سفر کرتا ہو۔

(3) خلائی جرم یا اسپیس آبجیکٹس (جمع) خلائی اجرام (Space objects) خلا میں پائے جانے والے تمام اجرام مثلاً کہکشائیں، ستارے، سیارے، خرد سیارے، دمدار سیارے اور گیس کے بادل وغیرہ خلائی اجرام کہلاتے ہیں۔

(4) مدار (Orbit) کسی بھی خلائی جرم کا وہ خیالی گول یا بیضوی دائرہ جس پر وہ سورج کے گرد چکر لگاتا ہو۔

(5) زمین کی کشش (Gravity of Earth) سائنسدانوں نے دریافت کیا کہ زمین پر تمام مادوں کی کشش کے ذریعہ زمین پر تمام چیزیں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں اور زمین کی کشش کے ذریعہ زمین پر تمام مادے زمین کی سطح پر موجود ہیں کیونکہ زمین کی کشش زمین پر تمام مادوں سے زیادہ ہے۔

(6) رصدگاہ یا آبزرویٹری (Observatory) وہ گنبد نما خاص عمارت جہاں دوربین نصب ہوتی ہے اور فلکیاتی ماہر یا شوقین ہیئت داں خلائی اجرام کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

(7) قدرتی سیارچہ یا چاند (Sattelite) سیاروں کے گرد اپنے مدار میں گردش کرنے والے اجرام۔

(8) ناسا (NASA) یہ لفظ مخفف ہے الفاظ National Aeronautics & Space Administration کا جو امریکہ کی قومی خلائی ایجنسی ہے جو خلائی اجرام کی تحقیق کر رہی ہے۔یہ 1958 میں قائم ہوئی تھی۔اس کا ہیڈ کواٹر واشنگٹن ڈی۔سی۔ ہے۔ اس کے بانی جناب وائٹ ڈی۔ آئزن آور (Dwight D. Eisenhower) تھے۔

(9) حجر شہابی (Meteorite) خلا میں دھات یا پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو اکثر کسی سیارہ یا دمدار سیارہ سے گرا ہوا ہوتا ہے۔

حوالہ جات:

(1) ویب سائٹ وکی پیڈیا۔

(2) دی انڈین ایکسپریس بتاریخ 25 نومبر 2021 مضمون بعنوان "Ramming into an asteroid to save the planet - if needed" صفحہ 15 مصنف The New York Times & NASA۔

(3) مضمون 'جاپان کے خلائی جہاز ہیابوسا۔دوم نے خرد سیارہ؛ یگوگو کی کان کنی کر کے اس کا مادہ زمین تک پہنچایا' مصنف انیس الحسن صدیقی، شائع نیوز لیٹر "تجسس" شمارہ۔1، جنوری 2021، وگیان پرسار، نوآئیڈا (یوپی)

■

Aneesul Hasan Siddiqui
679, Sector 22-B,
Gurugram - 122015 (Haryana)
Mob.: 9654949434

ہندستان اسٹیل لمیٹڈ (HSL) کی تشکیلِ نو

نصیر افسر

ہندستان اسٹیل لمیٹڈ (HSL) حکومت ہند کے محکمہ اسٹیل اینڈ مائنس کے تحت چلنے والی A ون کمپنی تھی جس کا صدر دفتر شروع میں نئی دہلی میں واقع تھا مگر ملک کے پہلے عزت مآب صدر ڈاکٹر راجندر پرساد کی خواہش پر اسے نئی دہلی سے جنوبی بہار کے شہر رانچی میں دسمبر 1959 میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ لیکن کمپنی کے سامنے ایک بڑا مسئلہ اچھی، بڑی اور پختہ عمارت کی دستیابی کا تھا۔ اس زمانے میں شہر رانچی میں اچھی، بڑی اور پختہ عمارتوں کی بڑی کمی تھی کیوں کہ شہر رانچی محض ایک ہل اسٹیشن کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ شہر اس وقت کانکے میں واقع پاگل خانے کی وجہ ہی مشہور تھا جہاں ملک بھر کے پاگلوں کا علاج ممکن تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ رانچی شہر موسم گرما میں انگریزی حکومت کی راجدھانی ہوا کرتی تھی اور پٹنہ (بہار) سے تمام افسران و ملازمین چار مہینوں کے لیے رانچی منتقل ہو جایا کرتے تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں رانچی کا موسم گرمیوں میں بہت ہی خوشگوار ہوا کرتا تھا۔

انگریزی حکومت کے لیے رانچی کے ڈورنڈا علاقے میں پتھروں سے لال رنگ کی ایک عمارت تھی جسے سکریٹریٹ (Secretariat) بلڈنگ کہا جاتا تھا اور فی الوقت جھارکھنڈ ہائی کورٹ اسی لال رنگ کی بلڈنگ میں چلتی ہے اور اب اسے ہائی کورٹ بلڈنگ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کو یہی لال رنگ پختہ عمارت دستیاب کرائی گئی تھی۔ اس عمارت کے بہت ہی قریب کئی ایکڑ پر مشتمل ایک انگریزی بنگلہ تھا جسے ہندستان اسٹیل کی نئی عمارت کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سال ڈیڑھ سال میں ہندستان اسٹیل کی چھ منزلہ نئی عمارت تیار ہو گئی تھی اور صدر دفتر سکریٹریٹ بلڈنگ سے نئی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ شہر رانچی کو ایک بڑی اور

خوبصورت عمارت مل گئی تھی اور لوگ اسے HSL بلڈنگ کے نام سے جاننے لگے تھے۔ ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کے صدر دفتر کو دہلی سے رانچی منتقل کرنے کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ اس کے سبھی پلانٹس اور کارخانے یعنی راوٗر کیلا اسٹیل پلانٹ، بھلائی اسٹیل پلانٹ، بوکارو اسٹیل پلانٹ، درگا پور اسٹیل پلانٹ، درگاپور (Alloy) الائے اسٹیل پلانٹ، بھارت کوکنگ کول لمیٹڈ وسنٹرل انجینئرنگ ڈیزائن بیورو کے لیے رانچی شہر مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ روز اول سے ہی ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کے افسران و ملازمین میں یہ خواہش ابھر کر سامنے آنے لگی تھی کہ کاش ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کا صدر دفتر پھر سے دہلی واپس ہوجاتا۔ ان کی یہ خواہش حکومت ہند کے وزیر برائے اسٹیل اینڈ مائنس جناب موہن کمار منگلم کے کانوں تک پہنچی اور انھوں نے پارلیامنٹ میں ایک خصوصی تجویز (Special Resolution) پاس کرادیا کہ رانچی میں واقع ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کی تشکیل نو (Restructuring) کی جائے گی اور یکم / اپریل 1973 کو ایک ہولڈنگ کمپنی (Holding Copmany) کا قیام عمل میں آجائے گا جس کا نام اسٹیل اتھاریٹی آف انڈیا لمیٹڈ ہوگا۔ اس کا صدر دفتر رانچی سے منتقل ہوکر دہلی آجائے گا۔ اسی کے ساتھ ایک اور نئی کمپنی کا جنم ہوگا جو سنٹرل انجینئرنگ اینڈ ڈیزائن بیورو کی جگہ لے لے گی۔ ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کے رانچی میں جو بھی اثاثے ہیں جیسے چھ منزلہ ایڈ منسٹریٹیو بلڈنگ، شیاملی کالونی، اسکول، ہسپتال وغیرہ وہ نئی کمپنی MECON لمیٹڈ کو یکم / اپریل سے دو کروڑ دس لاکھ چار ہزار روپے کی رقم کے عوض HSL سے MECON کو ٹرانسفر ہوجائیں گے۔ اس خبر سے افسران و ملازمین کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا جو صدر دفتر کو دہلی واپس لے جانے کے خواہش مند تھے۔

میں یہ بات بتاتا چلوں کہ اپنے ملک بھارت میں ہولڈنگ کمپنی (Holding Company) کی مثال نہیں ملتی تھی اس طرح اسٹیل اتھاریٹی آف انڈیا لمیٹڈ (Steel Autharity of India Limited) یعنی SAIL کو ملک کی پہلی ہولڈنگ کمپنی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کے رانچی میں واقع تمام تر اثاثے (Assets) میکن لمیٹڈ کے نام ٹرانسفر تو ہوگئے مگر افسران و ملازمین کے تبادلے کا مسئلہ سامنے آیا تو یہ واضح کردیا گیا کہ جس افسر و ملازم کو جہاں جانا ہے وہ اپنا Option دے دے کہ وہ کس پلانٹ یا دفتر میں جانا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے سبھی اپنے آبائی شہر کے قریب والے پلانٹ یا دفتر میں جانے کا Option دے کر خوش ہوگئے۔ جو میری طرح مقامی حضرات یا آس پاس کے علاقے کے تھے انھوں نے MECON LTD کا Option دیا کہ انھیں رانچی رہنا تھا۔ اب تو ہندستان اسٹیل کا صدر دفتر میکن کے صدر دفتر سے جانا جانے لگا تھا حتیٰ کہ HSL کالونی بھی میکن کالونی کے نام سے مشہور ہونے لگی تھی۔ HSL کا جواہر ودیا مندر اسکول بھی اب میکن کا ہوگیا تھا۔

یہ بتانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندستان اسٹیل لمیٹڈ کے دہلی سے رانچی منتقل ہونے کے بعد شہر رانچی کو ایک اور سوغات ملی کہ ایشیا (ASIA) میں اپنے طرز کا سب سے بڑا مشین بنانے کا کارخانہ ہیوی انجینئرنگ کارپوریشن لمیٹڈ (HEC) کی تعمیر کا بھی کام 1960 سے شروع ہوچکا تھا جو 1963 میں روس اور چیکوسلوواکیہ کے اشتراک سے مکمل ہوگیا تھا۔

■

Naseer Afsar
D-1, Friends' Compound,Rahmat Colony,
PO & PS - Doranda
Ranchi- 834002 (Jharkhand)
Mob.: 9431583915 / 8789350800

ابوطالب انصاری

وِٹامن

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک   تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

وٹامن (حیاتین) کا معمولی مقدار میں ہونا ضروری ہے۔ وٹامن غذا سے حاصل ہوتی ہیں۔ کچھ وٹامن کو ہمارا جسم بناتا ہے جب کہ کچھ لیباریٹری میں بھی بنائے جاتے ہیں۔ کچھ وٹامن (الف، د، ای اور ک) کو جذب ہونے کے لیے چربی جب کہ کچھ وٹامن (بی کمپلیکس اور ج) کو جذب ہونے کے لیے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن اے: * وٹامن اے، گاجر، کیلا، دودھ، مکھن، بالائی، مچھلی، جگر، آم وغیرہ میں پایا جاتا ہے۔

* وٹامن اے کی کمی سے شبکوری، زیروپتھالمیا اور جلد کے امراض (سوکھی جلد) ہوتے ہیں۔
* ہمیں روزانہ 600 مائیکروگرام وٹامن اے کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن د: * وٹامن د، سورج کی روشنی، مچھلی، مچھلی کے جگر کا تیل، دودھ، وناسپتی، سورج مکھی کا بیج وغیرہ پایا جاتا ہے۔

* وٹامن د کی کمی سے ہڈیوں کی کمزوری (رکیٹ، اوسٹوملاسیا) اور عضلات کی کمزوری پیدا ہوجاتی ہے۔
* ہمیں روزانہ 1400 آئی یو وٹامن د کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن ای: * نٹس، بغیر چھلے ہوئے اناج، روغنیات، گہرے سبز رنگ کے ساگ اور پھلی والی سبزیوں میں وٹامن ای، پایا جاتا ہے۔

* وٹامن ای، کی کمی سے بانجھ پن اور عضلات کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔
* ہمیں روزانہ 10 آئی یو وٹامن ای کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن ک : * وٹامن ک، ہرے پتوں والی سبزیاں، پھول گوبھی، ٹماٹر، روغنیات وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

* ہماری روزمرہ کی ضرورت کا آدھا حصہ بیکٹیریا (آنتوں کے فلورا) خود تیار کر لیتے ہیں۔
* وٹامن ک، کی کمی سے جریان خون کی شکایت ہوجاتی ہے۔
* ہمیں روزانہ 80 مائیکروگرام حیاتین ک کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن بی کمپلیکس: * بی کمپلیکس میں تھیامن (B_1)، ربوفلیون (B_2)، نیاسن (Nipcin)، پینٹوتھینک ایسیڈ (Pantothenic Acid)، پائیری ڈوکسن (B6)، فولک ایسڈ (Folic acid)، کوبالامن (Cobalamines)، لیٹرائل نائٹریلوسائڈ (Laterile nitriloside)، بایوٹن، کولین شامل ہیں۔

* **تھیامن (B_1)**: (1) یہ اناج، پنیر، دودھ، انڈا، گہرے

ہرے رنگ کے ساگ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ خلیات کو درست حالت میں رکھتے ہیں اور بدہضمی کو دور کرتے ہیں۔ (3) ہمیں اس کی روزانہ 1ء7 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

* **نیاسن (Niacin)**: (1) یہ گوشت، مچھلی، انڈا، دودھ، اناج، آلو اور پتوں والے ساگ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ عضلات، اعصاب، استحالہ اور ہاضمے کے لیے مفید ہیں۔ (3) اس کی کمی سے 'پیلیے گرا' نامی مرض ہوتا ہے۔ (4) ہمیں اس کی روزانہ 19 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

* **پینٹوتھینک ایسڈ (Pantothenic Acid)**: (1) گوشت، مچھلی، بغیر چھلے اناج اور سبزیوں وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ استحالے، ہارمون، اینٹی باڈی اور نیوروٹرانسمیٹر کے لیے ضروری ہیں۔ (3) ہمیں اس کی روزانہ 5ء7 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ (4) اس کی کمی سے ہاتھوں پیروں میں جلن، الجھن اور ڈپریشن پیدا ہوتا ہے۔

* **پائیری ڈوکسن (B6)**: (1) گوشت، انڈا، بغیر چھلے اناج، کیلا اور خربوزہ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ استحالے، اعصابی امراض اور خون بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ (3) یہ نمکیات کے تناسب کو کنٹرول کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ (4) ہمیں اس کی روزانہ 2 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

* **فولک ایسڈ (Folicacid)**: (1) یہ ہرے پتوں کے ساگ، بروکولی، بغیر چھلی دالیں، لیما بین وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ خون کی کمی، امراض قلب و عروق کے علاوہ خلیات کو نشو ونما کے لیے ضروری ہیں۔ (3) ہمیں اس کی روزانہ 400 مائیکروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

* **کوبالامن (Cobalamines)**: (1) اس میں سائنوکو بالامن، ہائیڈروکسی کو بالامن، متھیل کوبالامن اور اڈینوسن کو بالامن شامل ہیں۔ یہی وٹامن B_{12} کہلاتے ہیں۔ (2) یہ جگر، گردہ، دودھ، کیلا اور انگور وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (3) یہ اعصابی اور نفسیاتی امراض میں مفید ہیں۔ (4) ہمیں اس کی روزانہ 2 مائیکروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

* **لیٹرائل نائٹریلو سائڈ (Laterile nitriloside)**: (1) یہ خوبانی، آڑو، آلو بخارا، بلیک بیری وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ کینسر کے لیے مفید ہے۔ (3) ہمیں اس کی روزانہ 100-500 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے (کینسر کے مریضوں کے لیے)۔

* **بایوٹن (Biotin)**: (1) یہ دودھ، انڈا، گردہ، نٹس وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ جلد اور بالوں کے امراض کے لیے مفید ہے۔ (3) ہمیں اس کی روزانہ 10 مائیکروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

* **کولین (Choline)**: (1) یہ گیہوں کا اکھوا، ہرے ساگ، انڈہ، جگر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔ (2) یہ امراض جگر، گردہ اور دل کے لیے مفید ہیں۔ (3) ہمیں اس کی روزانہ 600 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

وٹامن ج: * یہ کھٹے پھل (سنترہ، موسمبی، مالٹا، لیموں، آملہ)، مرچ (سرخ اور ہری مرچ) اور ہری سبزیوں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔

* یہ زخم کو بھرتا ہے۔ * دفاعی قوت کو مضبوط کرتا ہے۔
* مسوڑھوں اور ہڈیوں کو مضبوط کرتا ہے۔
* خون بنانے میں معاونت کرتا ہے۔
* اس کی کمی سے اسکروی نامی بیماری پیدا ہوتی ہے۔
* ہمیں اس کی روزانہ 60 ملی گرام کی ضرورت ہوتی ہے۔

■

ماخذ: غذائی راز، **مصنف**: ڈاکٹر ابوطالب انصاری، موبائل: 9823755795، **سنہ اشاعت**: 2021

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔
'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر وتقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

—فانی بدایونی

مجھے خبر نہیں غم کیا ہے اور خوشی کیا ہے
یہ زندگی کی ہے صورت تو زندگی کیا ہے

—احسن مارہروی

خواب کا رشتہ حقیقت سے نہ جوڑا جائے
آئینہ ہے اسے پتھر سے نہ توڑا جائے

—ملک زادہ منظور احمد

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

—بشیر بدر

یہی ہے زندگی کچھ خواب چند امیدیں
انہیں کھلونوں سے تم بھی بہل سکو تو چلو

—ندا فاضلی

یہ ضروری ہے کہ آنکھوں کا بھرم قائم رہے
نیند رکھو یا نہ رکھو خواب معیاری رکھو

—راحت اندوری

زندگی خواب دیکھتی ہے مگر
زندگی زندگی ہے خواب نہیں

—شبنم رومانی

تمام عمر خوشی کی تلاش میں گزری
تمام عمر ترستے رہے خوشی کے لیے

—ابوالمجاہد زاہد

طلب کریں تو یہ آنکھیں بھی ان کو دے دوں میں
مگر یہ لوگ ان آنکھوں کے خواب مانگتے ہیں

—عباس رضوی

نیند کو لوگ موت کہتے ہیں
خواب کا نام زندگی بھی ہے

—احسن یوسف زئی

کہیں کوئی چراغ جلتا ہے
کچھ نہ کچھ روشنی رہے گی ابھی

—ابرار احمد

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

—وسیم بریلوی

احتشام باغوان، درجہ نہم، نماڑ ویلی انٹرنیشنل اسکول، برہانپور، مدھیہ پردیش

مسکان عارف خان، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول نیم گاؤں، بلڈانہ، مہاراشٹر

انابیہ امبر، درجہ اوّل، سینٹ میریز سینئر سیکنڈری اسکول، رامپور

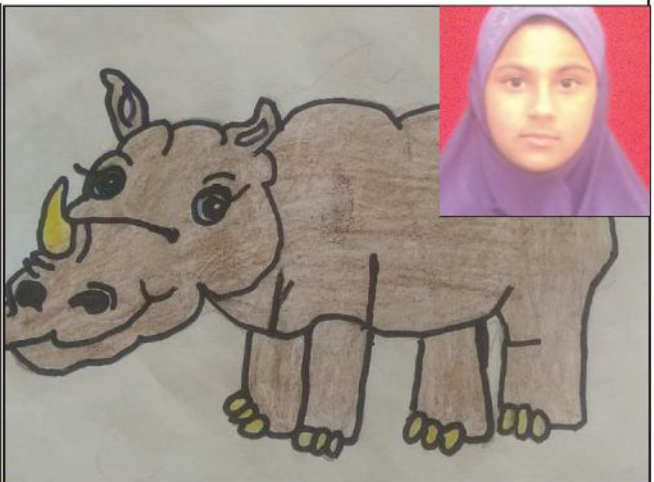

میسرہ گورو پاشا، درجہ ہشتم، مولانا آزاد اسکول ورودی، ضلع جالنہ، مہاراشٹر

مہک تبسم شیخ فیروز، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول نیم گاؤں، بلڈانہ، مہاراشٹر

رمیشہ ثمین محمد علیم، درجہ ہفتم، نگر پریشد اردو مڈل اسکول، ناندورہ، بلڈانہ، مہاراشٹر

مالیگاؤں کتاب میلہ 2021 میں طلبا و طالبات ثقافتی پروگرام پیش کرتے ہوئے

बच्चों की दुनिया मासिक, फरवरी 2022, वर्ष 10, अंक 02
BACHON KI DUNIYA Monthly, February 2022 Vol. 10, Issue: 02
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/01/2022
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام مالیگاؤں کتاب میلہ 2021 میں بچوں کی شرکت

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6